پاکستان

ایک پیاز دو روٹیاں

تحریک پاکستان کے دور کی واقعاتی
اور جذباتی کہانیاں

عنایت اللہ

فہرست

عنوان	مصنف	صفحہ
اِس جھنڈے میں میری عصمت کا خون شامل ہے	ایک خاتون / عصمت ریحانہ	۹
ایک آنکھ اور پاکستان	اصغر علی	۳۷
مجرم یا مجاہد؟	ابرار۔ بیگم ابرار	٦۵
پاکستان - ایک پیاز دو روٹیاں	س۔ب	۱۰۳
بینا کا دھرم، میری بہنوں کی عصمت	ع۔خ / ارشد پرویز	۱۳۱
اندھیری سیڑھیاں، روشن منزل	ارشاد علی / رضا کاظمی	۱۵۱
بھٹکی ہوئی منزل	عبدالجبار	۱۸۷

پیش لفظ

تحریکِ پاکستان کے فیصلہ کُن دَور (۱۹۴۶ء - ۴۷) کی یہ کہانیاں حقیقی ہیں، ولولہ انگیز اور ایمان افروز ہیں۔ جذبات، واقعات اور جذبۂ آزادی نے مل کر ایسی بے شمار کہانیوں کو جنم دیا ہے جو تفریحی ہی نہیں بلکہ ہماری تاریخ کا ایک درخشاں باب ہیں۔

آپ نے سُنا ہو گا کہ آج وہ بھی اپنے آپ کو پاکستان کا خالق کہہ رہے ہیں جو ——— "رہ گئے تھے دضو کرتے!" ——— یہ سچّی کہانیاں پڑھیئے۔ آپ کو اس سوال کا جواب مل جائے گا کہ پاکستان کس نے بنایا تھا اور کس طرح بنایا تھا!

پاکستان میں پیدا ہونے والی نسلوں کو تفصیل اور وضاحت سے نہیں بتایا جاتا کہ جو ۱۹۴۶ء - ۴۷ میں نوجوان تھے انہوں نے قرآن کا یہ خطہ حاصل کرنے کے لیے کیا قیمت ادا کی تھی۔ ان میں غریب، نادار اور نوجوان لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ مفلس نوجوان بھی شامل تھے۔ امیرزادے بھی تھے۔ وہ سب ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے تھے ——— یہ تاریخ ساز نوجوان تھے۔

یہ سب اب کہاں ہیں؟ ——— گمنام محلّوں اور غلیظ احاطوں میں گمنامی اور کسمپرسی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ خدا کے سوا انہیں کوئی نہیں پہچانتا۔ تاریخ نے انہیں اس لیے نہیں پہچانا کہ جب پاکستان

معرضِ وجود میں آیا تو پاکستان کے ایسے بے شمار "خالق اور معمار" اپنے آپ کو سامنے لے آئے جو شریکِ سفر نہ تھے۔ پاکستان کے اصل مجاہدین ان نام نہاد خالقوں اور معماروں کے سائے میں تاریخ کو نظر نہ آسکے۔

پاکستان میں بعض قلمکاروں نے تحریکِ پاکستان کی روئیداد لکھی ہے لیکن اس میں تاریخ کم اور شخصیت پرستی زیادہ ہے۔ پاکستان کے بعض ایسے سیاسی لیڈروں نے جو تحریکِ پاکستان کے مخالف کیمپ میں تھے، قلمکاروں، اخبار، رسالوں اور پبلشروں کو پیسے دے کر اپنے آپ کو تحریکِ پاکستان کا صفِ اوّل کا مجاہد ثابت کیا ہے۔

یہ شرف ماہنامہ "حکایت" کو حاصل ہے کہ ہم نے گمنام مجاہدینِ پاکستان کو کونوں کھدروں میں جا ڈھونڈا اور اُن کی جذباتی، واقعاتی، ولولہ انگیز اور بعض سنسنی خیز کہانیاں سامنے آئیں۔ یہ ہم "حکایت" میں شائع کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ یہ روئیداد ابھی ختم نہیں ہوئی۔

یہ کہانیاں پڑھ کر آپ بے ساختہ کہہ اُٹھیں گے کہ "حکایت" اور مکتبۂ داستان نے کتنا بڑا کام کیا ہے۔ ہمارے بچّوں کو ایسی ہی کہانیوں کی ضرورت ہے جن میں انہیں کہانی کی دلچسپیاں بھی ملیں اور اپنی تاریخ بھی۔ یہ کہانیاں ان میں ملّی جذبہ پیدا کریں گی۔

ان کہانیوں میں ایک خاتون کی کہانی —— "اِس جھنڈے میں میری عصمت کا خون شامل ہے" —— خاص طور پر پڑھنے والی ہے۔ ہمارے نوجوانوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم سے پاکستان کی یہ قیمت بھی وصول کی گئی تھی۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

خُونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہُو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ

اِس جھنڈے میں میری عصمت کا خون شامل ہے

"**اگست** کا مہینہ آتا ہے تو سینے کے زخم ہرے ہو جاتے ہیں" ـــــ اُس نے آہ بھری اور چُپ ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ اُس کا سر جھکتا چلا گیا۔ پھر اُس نے یکلخت سر اٹھا کر کہا "بیٹی! تم نے سنا ہو گا کہ بعض انسانوں کو ہمیشہ سانپ ڈستا ہے۔ کسی کو تین مہینے بعد، کسی کو چھ مہینے بعد اور کسی کو سال بعد۔ ڈسنے کے دن وہ انسان اپنے آپ کو چاہے کمرے میں بند کر لے، جہاں جی چاہے چلا جائے، سانپ پکّے فرش سے بھی نکل آتا ہے اور اُسے ڈس کر غائب ہو جاتا ہے"۔

اُس نے لمبی آہ بھر کر کہا ـــــ "مجھے ہر اگست میں سانپ ڈستا ہے۔ یہ سانپ میرے وجود کے اندر ہے، میرے ذہن میں رہتا ہے، میرے دل کے اندر کنڈلی مارے بیٹھا رہتا ہے ـــ سارا سال کچھ نہیں کہتا۔ اگست کا مہینہ قریب آتا ہے تو یہ مجھے ڈسنے لگتا ہے اور اگست گزر جانے تک ڈستا ہی چلا جاتا ہے۔ چوبیس اگست گزر گئے۔ پچیسواں آرہا ہے اور میں ادھ موئی ہوتی جا رہی ہوں۔ کسی کو اپنا روگ سُنا نہیں سکتی، کسی کو بتا نہیں سکتی۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں"۔ میں نے کہا ـــ "وہ سانپ ہی تھے۔ زہریلے ناگ..... لیکن ....." میں نے اس کے روگ کی تلخی کو ہلکا کرنے کے

لیے کہا ——— "وہ ہندوستان میں رہ گئے ہیں - آپ انہیں بھول کیوں نہیں جاتیں ؟ پچیس سال گزر گئے ہیں"۔

وہ جن آنسوؤں کو روکے ہوتے تھی وہ بہہ نکلے - اس کے سوا اُس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا - اس کے متعلق ایک سہیلی کی والدہ نے مجھ سے ذکر کیا تھا - بات شملہ مذاکرات کی ہو رہی تھی - جنگی قیدیوں کا ذکر آیا تو ایک لڑکی نے کہا ——— "ڈر یہ ہے کہ جنگی قیدیوں کے بدلے پاکستان کے وقار کا سودا نہ ہو جائے"۔

"میری بچیو" - سہیلی کی والدہ نے کہا - "تمہیں تو علم ہی نہیں کہ پاکستان نے ہم سے کتنی بڑی قربانیاں لی تھیں - تم سب تو پاکستان میں پیدا ہوئی ہو - جو ہم نے دیکھا اور جھیلا ہے وہ اللہ دشمن کو بھی نہ دکھائے - تم نے کبھی دودھ پیتے بچے کی لاش گلی میں پڑی دیکھی ہے ؟ ..... میں نے سینکڑوں دیکھی ہیں - لوگوں نے ہزاروں دیکھی ہیں، ہندوستان کی گلیوں اور کھیتوں میں ...... تم نے پردہ نشین مسلمان لڑکیوں کا ننگا جلوس دیکھا ہے ؟ ..... اُن سے پوچھو جو مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آئے ہیں ...... تم نے اتنی چیونٹیاں مری ہوئی نہیں دیکھی ہوں گی جتنی ہم نے وہاں مسلمانوں کی لاشیں دیکھی ہیں"۔

سہیلی کی والدہ جب مشرقی پنجاب میں اگست ۱۹۴۷ء کے دوران مسلمانوں کے قتلِ عام کی تفصیلات سنانے لگیں تو ہمارے جسم سُن ہوتے چلے گئے - ہم نے یہ ہیبت ناک کہانیاں سُنی تو بہت تھیں لیکن سہیلی کی والدہ آنکھوں دیکھی واردات سُنا رہی تھیں - انہوں نے پردہ نشین لڑکیوں کی آبرو ریزی کے واقعات سنائے انہوں نے کھیتوں میں مسلمان لڑکیوں کی ننگی لاشیں دیکھی تھیں -

سناتے سناتے ان کے آنسو بہنے لگے - انہوں نے بتایا کہ بہت سی لڑکیاں سکھوں کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو کر پاکستان آگئی تھیں - پاکستان میں ان

کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ اتنا ہی دردناک ہے جتنا وہ سلوک جو اُن کے ساتھ سکھوں نے کیا تھا -

"ایک کو تو میں جانتی بھی ہوں" ——— سہیلی کی والدہ نے کہا -

"پاکستان بننے کے ایک مہینہ بعد جانے کس طرح سکھوں کی قید سے نکل کر یہاں آئی - اسے ماں باپ والٹن کیمپ میں مِل گئے - پھر وہ لوگ لاہور میں آباد ہو گئے - لڑکی کی عمر بیس بائیس سال تھی - برادری میں اس کی شادی کی بات چلی تو کسی بھی گھرانے نے اسے قبول نہ کیا - سب نے کہا کہ لڑکی داغدار ہے -"

سہیلی کی والدہ نے اس کا واقعہ سنایا تو میں نے اُن سے اُس کا اتا پتا لے لیا اور ارادہ کر لیا کہ اُس پر جو گزری ہے وہ اُسی کی زبانی سُنوں گی - میں دوسرے دن اس کے گھر چلی گئی - یہی ایک ڈر تھا کہ وہ اپنی آپ بیتی نہیں سنائے گی - بات ہی کچھ ایسی ہے - میں اس کے گھر تک پہنچتے سوچتی رہی تھی کہ اسے کس طرح اکساؤں گی کہ جو اُس پر بیتی ہے وہ سُنا دے -

میں اس کے گھر میں داخل ہوئی تو وہ کچھ اس طرح حیران ہوئی جیسے میں غلطی سے اس کے گھر میں چلی گئی ہوں - میں نے اسے کہا ——— "خالہ جی، میں آپ ہی سے ملنے آئی ہوں -"

اس نے مجھے بٹھایا اور میرے سامنے چارپائی پر بیٹھ گئی -

مَیں نے سوچا تو بہت کچھ تھا مگر اُس کے سامنے بیٹھ کر میری زبان گنگ ہو گئی - وہ چپ چاپ مجھے دیکھ رہی تھی اور میں مضطرب سی ہو کے اس کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھی - اس کی جوانی ڈھل چکی ہے - بڑھاپے نے تسلط جما لیا ہے - سر کے بال کھچڑی ہو چکے ہیں - ہونٹوں کے قریب لکیریں گہری اور لمبی ہو رہی ہیں -

"پڑھتی ہو بیٹی ؟" اُس نے سکوت توڑا -

"ہاں خالہ جی !" میرے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا - "میں پڑھتی ہوں -"

آج کل پاکستان کی تاریخ پڑھ رہی ہوں لیکن جو تاریخ آپ کے سینے میں لکھی ہوئی ہے وہ کسی کتاب میں نہیں ملتی ۔ وہی پاکستان کی صحیح تاریخ ہے ۔ کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ تو لفظوں کا سیاہ پردہ ہے جو لکھنے والوں نے اس حقیقت پر ڈال دیا ہے جو آپ کے سینے میں ہے ۔"

وہ ہے تو ان پڑھ لیکن میری بات فوراً سمجھ گئی ۔ اس نے دھیمی سی آواز میں پوچھا — "تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے" ؟

"آپ کی ایک جاننے والی نے جو آپ کا نام لے کر رو پڑی تھی ۔"

"کون ہے وہ جو میرا نام لے کر رو پڑے گا !" — اُس نے طنز سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا — "یہ جھوٹ ہے بیٹی ! میرا نام لے کر نہ کبھی کوئی رویا ہے نہ کوئی روئے گا ۔ ہاں مر جاؤں گی تو شاید میرے بچے روئیں گے ۔"

میں اس کی بپتا تو سن ہی چکی تھی ۔ اب اس کی بات سنی تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے —— اور عورت کے آنسوؤں نے عورت کا دل جیت لیا ۔ اُس نے پوچھا —— "تم مجھ سے سننے آئی ہو کہ میں کس طرح بے عزت ہوئی تھی اور پاکستان میں میرے ساتھ کیا ہوا ؟ میرا نام لے کر رونے والی نے تمہیں بتایا نہیں تھا ؟"

"میں آپ کی زبان سے سننا چاہتی ہوں ۔"

"کیا کرو گی سن کر" ؟

"لکھوں گی اور لوگ پڑھیں گے ۔"

"پھر کیا ہو گا ؟"

"میں انہیں بتانا چاہتی ہوں کہ ...."

میں رک گئی اور سوچنے لگی کہ کیا کہوں لیکن وہ بول پڑی ۔ اس نے کہا — "انہیں صرف اتنا بتا دو کہ پاکستان کے جھنڈے میں میری عصمت کا خون شامل ہے ...... انہیں یہ بتا دو کہ اس سبز جھنڈے کو قریب سے دیکھو تو اس میں تمہیں مجھ جیسی ہزاروں کنواری بیٹیوں کی عصمتوں کا خون نظر آئے گا" ——

وہ اٹھی اور یہ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی —— "چائے کے لیے پانی رکھ آؤں ۔"

اس عورت کے گھر میں غریبی تو نہیں ہے لیکن فارغ البالی کے آثار بھی نظر نہیں آتے ۔ اس کے سراپا میں اور خاص طور پر اس کی آنکھوں میں ایسا تاثر نظر آیا جو ہر ایک عورت میں کم ہی نظر آتا ہے ۔ بولنے کے انداز میں جھجک نہیں، ہر بات خود اعتمادی سے اور دو ٹوک لہجے میں کرتی ہے ۔

چائے کے لیے پانی رکھ کر وہ میرے سامنے آ بیٹھی اور کہنے لگی ——

"میں لکھ پڑھ تو سکتی نہیں ۔ جاہل عورت ہوں ۔ جو منہ میں آیا بک ڈالوں گی ۔ وہ تم لکھو گی نہیں ۔ یہی میری کہانی ہے جو پچیس سال ہوئے کانٹے کی طرح چبھ رہی ہے ۔ اگست کا مہینہ آتا ہے تو سینے کے زخم ہرے ہو جاتے ہیں ۔ ۱۴ اگست کے روز لوگ خوشیاں مناتے ہیں ۔ جلسے کرتے ہیں اور میرے بچوں کے ابا بتاتے ہیں کہ بڑے لوگ رات کو جشن مناتے اور شراب پیتے ہیں مگر میرے لیے چودہ اگست کا دن حشر کا دن ہوتا ہے ۔ صبح سویرے جب توپیں سلامی دیتی ہیں تو میں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتی ہوں ۔ چھاؤنی اتنی قریب ہے کہ توپوں کے دھماکے سینے میں لگتے ہیں ۔ یہ دھماکے مجھے دھکے دے دے کر مشرقی پنجاب پہنچا دیتے ہیں ۔ پھر میں بڑی مشکل سے وہاں سے ادھر آتی ہوں ۔"

"خالہ جی ! آپ کو پاکستان اچھا نہیں لگتا ؟ آپ کو آزادی کی خوشیاں بری لگتی ہیں" ؟

"کس نے کہا ہے تجھے بیٹی کہ مجھے پاکستان اچھا نہیں لگتا ؟ اگر اچھا نہ لگتا تو میں چار سکھوں کے قبضے سے بھاگ کیوں آتی ؟ تیس کوس کا فاصلہ پاؤں چھیل کے کیوں طے کرتی ؟ مجھ جیسی عورت کی قسمت میں ایک مرد ہی لکھا ہوتا ہے نا ! وہاں میں اکٹھے چار مردوں کے ساتھ رہی ۔ پندرہ دن رہی لیکن بیٹی ، میں کچھ سمجھتی تھی نا ، کچھ سوچ بھی سکتی تھی نا ، میں مسلمان کی جنی تھی اور میرا گھر پاکستان تھا میں

پاکستان کی تھی اس لیے چلی آئی ۔ مجھے پاکستان اُس وقت بھی اچھا لگتا تھا۔ آج بھی اچھا لگتا ہے ۔"

"آپ کے گاؤں کا نام کیا تھا ؟"

"مت پوچھو ..... بتا دوں گی ۔ لکھنا نہیں ۔"

"کیوں ؟"

"میرے جننے والوں کی بے عزتی ہوگی" ۔۔۔۔ اس نے طنز سے بھری ہوئی مسکراہٹ سے کہا ۔۔۔۔ "میرے بھائیوں کی ناک کٹ جائے گی اور میری برادری کے بزرگوں کی بے عزتی ہوگی ۔ وہ عزت دار لوگ ہیں نا۔ میں ان کی سفید پگڑی پر سیاہ دھبّہ ہوں جسے وہ دوسروں سے چھپائے چھپائے پھرتے ہیں ۔"

"وہ کہاں ہیں ؟"

"جہاں بھی ہیں خوش رہیں ۔ سنا ہے بڑے زمیندار ہیں ۔ ٹیوب ویل لگے ہوئے ہیں اور اناج ٹرکوں پر منڈی میں جاتا ہے ۔ ادھر میرا حال دیکھو ۔ ایک کھاٹ پر تین بچے سوتے ہیں ۔ ان کے ابا کے مہمان آجائیں تو ہم فرش پر بستر ڈال لیتے ہیں ..... پر شکر ہے پیدا کرنے والے کا" ۔۔۔۔ اُس نے سکون آمیز آہ بھر کر کہا ۔۔۔ "اُس کا مجھے کوئی گلہ نہیں ۔ میں نے اللہ کی ذات سے جو مانگا تھا وہ اُس نے دے دیا ۔"

وہ اٹھی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی ۔ چھوٹی سی ایک میز اٹھا لائی ۔ پھر اس پر چائے کی دو پیالیاں لا رکھیں ۔ اپنے گاؤں کا نام بتا کر اس نے کہا "اس گاؤں میں سکھ اور مسلمان اکٹھے رہتے تھے ۔ ہماری منڈھیں سانجھی تھیں ۔ کٹھے سانجھے تھے مگر دلوں میں کوئی سانجھ نہیں تھی ۔ پھر جب ۱۹۴۷ کا سن چڑھا تو ہماری دشمنی دلوں سے نکل کر سامنے آگئی ۔"

"خالہ جی ! آپ کو یہ دشمنی اچھی لگتی تھی یا بُری ؟"

"دشمنی اپنوں سے ہو تو بُری ہوتی ہے" ۔ اُس نے فوراً جواب دیا ۔۔۔ "ان کافروں کے ساتھ جو دشمنی تھی بڑی اچھی لگتی تھی ۔ میں بچّی تو نہیں تھی اس وقت میری عمر تئیس سال تھی ۔ میری منگنی ہو چکی تھی ۔ دن مقرر کرنے باقی تھے ۔ میں اس دشمنی کی وجہ سمجھتی تھی ۔ گاؤں کے بچے بھی سمجھ گئے تھے کہ مسلمان اپنا ایک الگ ملک بنانا چاہتے ہیں جس میں اسلامی حکومت ہوگی ۔ سکھوں اور ہندوؤں کو تو یہ پسند نہیں تھا نا ! ہم نے اپنی منڈیروں پر سبز جھنڈے چڑھا دیئے تھے ۔ بچے ہاتھوں میں سبز جھنڈیاں اٹھائے پھرتے تھے اور کھیلتے کودتے ان کی زبان پر یہی ایک نعرہ رہتا تھا ۔۔۔۔ لے کے رہیں گے پاکستان ....

"میں سب کچھ سمجھتی تھی ۔ جب پرچیاں پڑی تھیں (۱۹۴۶ء کے انتخابات میں) تو کانگریسیوں نے ہمیں کہا تھا کہ دس روپے فی پرچی دیں گے ، پرچی کانگرس کے ممبر کو دینا ۔ ہر ایک مسلمان نے انکار کر دیا تھا ۔ جب پرچیاں ڈالنے کا وقت آیا تو ہندوؤں اور سکھوں کے بزرگوں نے گاؤں کے مسلمانوں کو اکٹھا کر کے کہا تھا کہ تم لوگ بیوقوف نہ بنو ۔ تم جسے قائد اعظم کہتے ہو وہ انگریزوں کا آدمی ہے ۔ وہ تمہیں ایسی جگہ مارے گا جہاں تمہیں پانی بھی نہیں ملے گا .....

"ہمارا ایک بوڑھا اُٹھ کھڑا ہوا ۔ اس نے کافروں کے بزرگوں سے کہا ۔۔۔ "سنو بھائی بندو ! جو بات تمہارے دل میں ہے وہ کرو ۔ ہم اپنے لیڈروں کی بے حرمتی برداشت نہیں کریں گے" ۔۔۔۔ ہم بہت سی لڑکیاں منڈیروں پر بیٹھی سن رہی تھیں ۔ وہ لوگ گاؤں کے درمیان بیٹھے باتیں کر رہے تھے ۔ ہندو اور سکھ بہت چالاک تھے ۔ وہ پہلو بدل گئے ۔ ہمدردی سے کہنے لگے ۔۔۔۔ "ہم کسی کی بے حرمتی نہیں کرتے ۔ تم ہمارے بھائی ہو ۔ ہم اکٹھے جنمے ، پلے اور ان کھیتوں میں کھیل کر بڑے ہوئے ہیں ۔ ہم تمہارے بھلے کی بات کرتے ہیں ۔۔۔ پاکستان بن بھی گیا تو یہ علاقہ ہندوستان میں رہے گا ۔ ہم پہلے والے پیار سے اکٹھے رہنا چاہتے ہیں ۔ اس کا ثبوت ہم یہ پیش کرتے ہیں کہ تم ہمارے ممبر کو پرچیاں دو

اور پرچیاں دینے سے پہلے تیس روپے فی پرچی ہم سے نقد لے لو'۔۔۔۔۔

" ہمارے بزرگ اٹھ کھڑے ہوئے ۔ ہر ایک نے ہی ایک جواب دیا کہ ایک طرف ہمارا ایمان ہے اور دوسری طرف تم ہو ۔ اس گاؤں کا کوئی مسلمان اپنا ایمان تیس روپوں پر نہیں بیچے گا ۔۔۔۔۔ بہت شور شرابا ہوا ۔ ہماری مائیں بھی بول پڑیں ۔ کئی عورتوں نے مردوں سے کہا کہ خبردار اپنی پگڑیاں کافروں کے پاؤں میں نہ رکھ دینا ۔"

اُس نے آہ بھری اور دکھ بھری آواز میں کہنے لگی ـــــ " تم جیسی لڑکیاں جو پاکستان میں پیدا ہوئی ہیں کیسے یقین کریں گی کہ اَن پڑھ کسانوں کی جاہل اور جنگلی عورتوں میں یہ جذبہ تھا ۔۔۔۔۔ کوئی نہیں بیٹی ! آج کوئی بھی یقین نہیں کرے گا ۔۔۔۔۔ زمانہ ننگا ہو گیا ہے ۔ لڑکیاں ننگی ہو گئی ہیں ۔ لڑکے ننگے ہو گئے ہیں ۔ قوم کی غیرت ہی ننگی ہو گئی ہے ۔ آج تم سے اُس وقت کی باتیں کر رہی ہوں تو ایسے لگتا ہے جیسے میں جھوٹ بول رہی ہوں ۔"

اس نے چونک کر کہا ـــــ " چائے پیو نا بیٹی ! ٹھنڈی ہو رہی ہے ۔ پی لو ۔ میں دوسری پیالی لے آؤں گی ۔"

میں نے چائے کی پیالی اُٹھا کر ایک گھونٹ لیا تو حلق میں کوئی چیز اٹکی ہوئی محسوس ہوئی ۔ گھونٹ نگلا نہیں جا رہا تھا ۔ اس کی باتیں اس کے سینے سے نکل رہی تھی ۔ یہ غلط نہیں کہ بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے ۔ یہ اسی کی باتوں کا اثر تھا کہ میرا دل جیسے حلق میں آن کے اٹک گیا تھا ـــــ میں نے دو بیگموں کا انٹرویو لیا تھا ۔ اُف خدایا ! باتوں میں تصنع ، انداز میں بناوٹ اور انہوں نے انٹرویو دیتے اتنا وقت نہیں لگایا تھا جتنا اپنی تصویروں میں سے کوئی اچھا سا پوز منتخب کرتے صرف کیا تھا ۔ دونوں اپنی عمر کھا چکی ہیں مگر دونوں نے اپنی شادی کے وقت کے فوٹو دیئے تھے ۔ ـــــ میں نے دونوں کے انٹرویو نہیں لکھے تھے ۔

اور اب میں جس کا انٹرویو لے رہی تھی ۔ اس کے سینے سے الفاظ کسی کوشش

کے بغیر نکلتے چلے آ رہے تھے اور میرے دل میں اترتے چلے جا رہے تھے ۔ ان الفاظ کا ہی اثر تھا کہ آنسو اُمڈ کر میری آنکھوں میں آ جاتے تھے اور میں انہیں روک نہیں سکتی تھی ۔

" اُس وقت مسلمان مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا " ـــــ وہ کہہ رہی تھی ـــــ " ہندو اور سکھ ہمارے بزرگوں کا ٹکا سا جواب سن کر اٹھے اور دو سکھ بوڑھے چلتے چلتے ہمارے بزرگوں کے کانوں میں کہہ گئے ۔ " ہم سے دشمنی مول نہ لیتے تو اچھا تھا ۔ تمہارا ہی بھلا تھا " ـــــ ہم جو جوان لڑکیاں تھیں انہیں مردوں نے اُسی رات کہہ دیا کہ بے وقت گاؤں سے دُور نہ جایا کرو اور کوئی لڑکی اکیلی گاؤں سے باہر نہ جائے ۔۔۔۔۔

" پرچیاں پڑیں ۔ سکھ مسلمان اور ہندو کلہاڑیاں اور برچھیاں اٹھائے پرچیاں ڈالنے گئے ۔ عورتیں بھی ان کے ساتھ تھیں ۔ کافروں نے مسلمانوں کو دھمکیاں دیں اور پرچی کی قیمت پچاس روپے بھی کر دی لیکن جو سکھوں کے مسلمان مزارعے تھے انہوں نے بھی پرچی اُسی کو دی جسے مسلم لیگ نے کھڑا کیا تھا ۔ تین چار جگہوں پر لڑائی جھگڑا بھی ہوا ۔ سکھ بھی زخمی ہوئے ، ہندو اور مسلمان بھی ۔ اس کے بعد سکھ اور مسلمان ایک دوسرے کو بڑے غصے سے دیکھنے لگے ۔ بھائی بندی ختم ہو گئی ۔ صاحب سلامت بھی نہ رہی ۔ کبھی تو ایسے لگتا تھا کہ ہمارے اور ان کے ڈھور ڈنگر بھی ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں ۔۔۔۔۔

" تین چار مہینے گزرے تو خبر ملی کہ امرتسر میں خون خرابا ہو گیا ہے ۔ لوگ طرح طرح کی کہانیاں سناتے تھے ۔ بات یہ تھی کہ ہندوؤں سکھوں نے مسلمانوں کے ایک جنازے پر حملہ کیا تھا ۔ پھر مسلمانوں نے ان پر حملہ کیا تھا ۔ دونوں طرف بہت نقصان ہوا تھا ۔ اس کے بعد بس یہی ایک خبر ملتی تھی کہ آج فلاں جگہ کافر اور مسلمان ٹکرا گئے ۔ آج فلاں گاؤں کے دو مسلمان قتل ہو گئے ۔۔۔۔۔ اور پھر وہ دن آیا کہ ہر طرف شور مچ گیا ـــــ " بن گیا ۔۔۔۔۔ پاکستان بن گیا ۔۔۔۔۔ پاکستان زندہ باد ۔ ـــــ اس سے ہمارے گاؤں کے سکھوں کے تیور اور زیادہ بدل

گئے . . . . .

"ہمیں ساری باتوں کا تو پتہ نہیں چلتا تھا ۔ گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ ۱۴/ اگست کے روز ہندوستان کے دو حصے ہو جائیں گے ۔ ایک پاکستان اور دوسرا ہندوستان لیکن ہمارا گاؤں بلکہ سارے کا سارا ضلع ہندوستان میں رہے گا ۔ ایک طرف پاکستان بننے کی خوشی دوسری طرف اپنا گاؤں کافروں کے حصے میں جانے کا غم ۔ کچھ سمجھ نہ آئے کہ کیا کریں ۔ کچھ پڑھے لکھے سیانے مسلمان گاؤں گاؤں گھومتے تھے اور کہتے پھرتے تھے کہ اپنا اپنا بچاؤ کر لینا لیکن ہمیں تو ایسا وہم بھی نہ تھا کہ یہ کچھ ہو گا جو ہمارے ساتھ ہوا . . . . .

"ساون کے کالے کالے سیاہ بادل چڑھ آئے تھے ۔ یہ تو ہر سال آتے تھے اور کھل کر برستے تھے مگر اب برسے تو ایسے برسے کہ پانی کی بجائے خون برسنے لگا . . . . . اب بیٹی میں ساری بات کیسے سناؤں ۔ یہ تو بڑا لمبا قصہ ہے ۔ ابھی اگست کی چودہ تاریخ نہیں آئی تھی کہ ہمارے سبز جھنڈے خون سے لال ہو گئے ۔ ہمارے بچوں کی چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں بچوں کے خون میں تیرنے لگیں . . . . . رات ہم کوٹھے پر چڑھتی تھیں تو آسمان لال سرخ نظر آتا تھا ۔ کوئی کہتا امرتسر جل رہا ہے ۔ کوئی بتاتا ترن تارن جل رہا ہے ۔ دُور دُور چاروں طرف شعلے اُٹھتے نظر آتے تھے ۔ وہاں تو سارا پنجاب ہی جل رہا تھا اور شعلے بہت تیزی سے ہمارے گاؤں کی طرف بڑھے آ رہے تھے ، ہر رات قریب آ رہے تھے . . . . .

"ہمارا گاؤں ریلوے لائن اور سڑک سے بہت دور تھا اس لیے ہمیں معلوم نہ ہو سکا کہ مسلمان پاکستان کی طرف بھاگے جا رہے ہیں ۔ ہمارے گاؤں والوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ ہم اب یہاں نہیں رہ سکتے ۔ گھر بار چھوڑنے پڑیں گے لیکن کس کا جی چاہتا ہے کہ اپنے مکان ، زمینیں اور ساری عمر کی کمائی غیروں کے لیے چھوڑ جائیں؟ . . . پھر وہ دن آ ہی گیا جب ہم سے ساری پونجی اور ہمارے گھر اور زمینیں چھیننے والے آ گئے ۔ انہوں نے یہ سزا ہمیں اس لیے دی کہ ہم نے پاکستان کے

نام پر پرچیاں ڈالی تھیں . . . . .

"سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا جب دُور سے غل غپاڑہ سنائی دیا ۔ گولیاں بھی چل رہی تھیں ۔ مرد باہر نکل کر دیکھنے لگے ، اور لڑکیاں چھتوں پر چڑھ گئیں ۔ مجھے گاؤں سے کوئی ڈیڑھ میل دور انسان ہی انسان نظر آئے ۔ وہ دُور دُور تک پھیلے ہوئے تھے ۔ بہت سے بھاگ رہے تھے ۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی ۔ کچھ لوگ لڑ رہے تھے ۔ لوگ کرپانوں اور برچھیوں سے کٹ کٹ کر گر رہے تھے ۔ ہمارے مرد باہر سے اندر آ گئے اور جس کے ہاتھ میں جو آیا اٹھا لیا ۔ عورتوں اور بچوں کو بلایا ۔ بس پھر ایک دہشت تھی جو ہم پر طاری ہو گئی ۔ گولیوں کے دھماکے ہمارے گاؤں کے قریب آ گئے اور پھر سورج غروب ہو گیا . . . . . اس کے ساتھ ہی میری زندگی کا سورج تو ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا ۔ میرے لیے ایسی رات آ گئی جس کی کوئی صبح نہیں تھی . . . . .

"میں چھت پر کھڑی تھی ۔ مجھے یاد نہیں کہ گاؤں کی کوئی اور لڑکی بھی چھت پر کھڑی رہ گئی تھی یا نہیں ۔ میں کھڑی رہی اور کھیتوں میں مسلمانوں کو قتل ہوتے دیکھتی رہی ۔ ان کی تعداد ہزاروں تھی ۔ جہاں جہاں تک نظر جاتی تھی انسان ہی انسان نظر آتے تھے ۔ ہر کوئی بھاگ دوڑ رہا تھا اور مسلمان گر رہے تھے ۔ میں نے ایک فوجی ٹرک بھی دیکھا جو کھیتوں میں اِدھر اُدھر بھاگتا دوڑتا مشین گنیں چلا رہا تھا ۔ فوج بھی کافروں کا ساتھ دے رہی تھی ۔ اس خونی منظر پہ رات کا پردہ پڑتا گیا . . . . .

"ہمارے گاؤں کے سکھ جو ہم سے اب بولتے بھی نہیں تھے اور گاؤں میں چپ چاپ پھرتے رہتے تھے ، اچانک اُٹھ کھڑے ہوئے اور اچانک میرے گاؤں سے چیخیں اُٹھنے لگیں ۔ مجھے ایسے یاد آتا ہے کہ کسی نے مجھے آوازیں دی تھیں مگر میں جہاں کھڑی تھی وہیں جم کے رہ گئی تھی جیسے میں پتھر کا بُت بن گئی تھی ۔ رات کا اندھیرا پھیل گیا تو بھی اوپر کھڑی گاؤں کے اندر اور باہر سے اٹھتا ہوا شور سنتی رہی . . . . . تم مجھ سے پوچھو کہ وہ کیسا شور تھا تو میں تمہیں نہیں بتا سکوں گی ۔ بس

ایسے سمجھ لو کہ موت ہی موت تھی۔ چیخیں تھیں۔ بچے چیخ چیخ کر ماؤں کو پکار رہے تھے۔ کلہاڑیوں اور کرپانوں کے ٹکرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور یہ آوازیں تھوڑی سی نہیں تھیں۔ یوں سمجھ لو کہ رات کے اندھیرے میں ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے زمین پر نہ کوئی مکان ہے نہ کوئی درخت نہ کھیت نہ کوئی اور چیز اور آسمان پر تارے بھی نہیں۔ بس ایک شور ہے، زمین بھی شور، آسمان بھی شور۔

"لوگوں کے مرنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ بچے جو چھوٹی چھوٹی سبز جھنڈیاں گلیوں میں اٹھائے پھرتے تھے انہی گلیوں میں کاٹ دیئے گئے۔ ان معصوموں کے نعرے لہو میں ڈوب گئے۔ جن گلیوں میں یہ نعرہ گونجتا ہی رہتا تھا —— "لے کے رہیں گے پاکستان ..... زندہ باد پاکستان" —— ان گلیوں میں اب یہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں —— "ہُن کہو اوئے مُسلیو جندہ باد پاکستان ..... ہُن لو اوئے ناں پاکستان دا" —— اور اس کے ساتھ ہی غلیظ گالیاں سنائی دیتی تھیں اور اس کے ساتھ یہ آواز تو بار بار سنائی دیتی تھی —— "کرمے دی کُڑی چُک لو ..... چوہدری دی کُڑی نوں نہ چھڈنا ..... کوئی کُڑی نہ جان دینا ..... اور مجھے اپنا نام بھی سنائی دیا .....

"کسی سکھ کے منہ سے اپنا نام سنتے ہی میرے جسم میں جانے کیسی لہر دوڑ گئی کہ میں پتھر سے پھر انسان بن گئی اور انسان سے وہ لڑکی بن گئی جسے سکھ ڈھونڈ رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ گاؤں کے کس کس گھر میں جوان لڑکی ہے مگر مجھے ان سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ صرف اندھیرا تھا جس نے مجھے سکھوں سے چھپا رکھا تھا۔ میں بیٹھ گئی اور میں اپنے قریب کی ایک آواز سے ڈر گئی جیسے کوئی اڑتا ہوا میری منڈیر پر چڑھ آیا ہو۔ چونک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ جھنڈا پھڑپھڑا رہا تھا۔ ہوا بہت تیز ہو گئی تھی۔ اس سے جھنڈا پھڑپھڑایا تھا۔ اس کی آواز سے میرے آنسو نکل آئے پھر میں بے قابو ہو کر سسکیاں لینے لگی۔ میں یہ نہیں بتا سکتی کہ میں نے کچھ سوچ کر ایسے کیا تھا۔ ہوا یہ کہ میں نے اٹھ کر بانس سے جھنڈا الگ کر لیا اور دوپٹے کی طرح سر پر ڈال لیا۔"

"وہ اٹھی اور تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے ایک ٹرنک کھلنے کی آواز سنائی دی۔ دو تین منٹ بعد ٹرنک کا ڈھکنا بند ہوا اور وہ جب میرے سامنے آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک سبز کپڑا تھا۔ اس نے کپڑے کو کھول کر کہا —— "یہ تھا وہ جھنڈا" —— یہ تقریباً ڈیڑھ گز لمبا اور ایک گز چوڑا کپڑا تھا جس کے ایک طرف بانس ڈالنے کے لیے جگہ سلی ہوئی تھی۔ جھنڈے کے درمیان سفید کپڑے کا بے قاعدہ سا چاند اور اوٹ پٹانگ سا ستارہ سلا ہوا تھا۔ اُس نے جھنڈے کے دونوں کونے پکڑ کر بازو پھیلائے تو جھنڈا اس کے سینے کے سامنے پھیل گیا۔ اس کے اوپر اس کا چہرہ مجھے بڑا ہی معصوم اور پیارا لگا جیسے یہ عورت اس زمین کی نہیں اللہ کے آسمانوں کی مخلوق میں سے ہو۔ میں نے جھنڈے کو کم اور اُسے زیادہ غور سے دیکھا۔

اس نے سر جھکا کر چاند تارے کو دیکھا اور اس کی رندھی ہوئی آواز سنائی دی —— "یہ تھا وہ جھنڈا۔ میں نے اپنے ہاتھوں منڈیر پر لگایا تھا..." اور اس کی ہچکی نکل گئی۔ اس نے جھنڈے پر بدستور سر جھکائے ہوئے ایسا فقرہ کہا جس نے مجھے سر سے پاؤں تک ہلا ڈالا۔ اس کی رندھی ہوئی سرگوشی سنائی دی —— "اُس وقت میں کنواری تھی۔"

اُس کا یہ فقرہ تیر کی طرح میرے دل سے پار ہو گیا۔ یہ اس کی سسکی اور رندھی ہوئی سرگوشی کا تاثر تھا جو میری رگوں میں سرایت کر گیا اور ایسے لگا جیسے اس نے کہا ہو —— "پاکستان بننے سے پہلے میں کنواری تھی، پھر میں نے اپنا کنوارپن اس جھنڈے پر قربان کر دیا۔ اس جھنڈے کی قدر و قیمت کا اندازہ مجھ جیسی ہزاروں لڑکیاں ہی کر سکتی ہیں جو اپنا کنوارپن اس جھنڈے پر قربان کر آئی [illegible]" —— اس ایک عورت [illegible] ایک لڑکی [illegible] آئے لگی پھر وہ پاکستان کی غیرت اور [illegible] میرے سینے

سے آہ نکل گئی اور میں نے دل ہی دل میں خدا سے کہا۔ "اوہ میرے خدا! تیرے چاند تارے نے قوم سے کتنی بڑی قربانی لی ہے۔ اب تیری ہی ذاتِ باری اس جھنڈے کی لاج رکھ سکے گی۔ قوم کی بیٹیاں تو اس پر اپنی عزیز ترین متاع لٹا چکی ہیں۔"

اُس نے سر اٹھایا تو آنسو اُس کے گالوں پر بہے جا رہے تھے۔ اس نے جھنڈا اُوپر کیا۔ اس کا چہرہ ڈھک گیا۔ مجھے اس کی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ پھر اس نے ہاتھ سامنے کر کے جھنڈے کو چہرے پر دبا لیا اور اس کے آنسو اسی مقدس سبز کپڑے میں جذب ہونے لگے جسے وہ پچیس برسوں سے سنبھال کے رکھے ہوئے تھی۔ وہ وہیں سے گھومی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر ٹرنک کا ڈھکنا بند ہونے کی آواز سنائی دی اور وہ میرے سامنے آ بیٹھی۔ مجھے خیال آیا کہ اس جھنڈے میں اس عورت کے پچیس برسوں کے آنسو جذب ہو گئے ہوں گے۔

"خالہ جی! آپ چودہ اگست کے روز یہ جھنڈا منڈیر پر چڑھا دیتی ہوں گی؟"

"نہیں بیٹی!" اس نے جواب دیا۔ "کبھی کبھی اسے کھولتی ہوں۔ روتی ہوں اور اس سے آنسو پونچھ کر رکھ دیتی ہوں..... چڑھاتی نہیں۔"

"کیوں؟"

"ہوا سے پھڑپھڑاتا ہے تو میرے اندر سے سانپ نکل آتے ہیں اور مجھے ڈسنے لگتے ہیں۔ صرف ایک بار چڑھایا تھا پھر نہیں..... مرنے لگوں گی تو بچوں سے کہوں گی یہ میری میّت پر ڈال کر مجھے دفن کرنا۔"

"تو سنو بیٹی!" اس نے کہانی شروع کی ــــ "میں نے یہ جھنڈا اتار کر اپنے سر پر ڈال لیا۔ میں نہیں بتا سکتی کہ میں نے یہ کیوں نہ سوچا کہ میرے گھر والے کہاں ہیں اور میں جس چھت پر کھڑی ہوں اس کے نیچے کیا ہو رہا ہے۔ وہ وقت ہی ایسا تھا۔ گاؤں کے اندر لوٹ مار ہو رہی تھی اور ایک طرف سے اچانک شعلے اُٹھے۔ سکھوں نے گاؤں کے مکان جلانے شروع کر دیئے۔ دیکھتے ہی

دیکھتے کئی ایک مکان جلنے لگے اور میں شعلوں میں گھر گئی۔ میں یکلخت دوڑ پڑی۔ صحن کی طرف جانے کی بجائے میں پچھواڑے کی طرف گئی..... تم نے دیہات کے مکان دیکھے ہوں گے بیٹی! اونچے نہیں ہوتے۔ میں پیچھے کو لٹکی اور کود آئی۔ پھر میں دوڑ پڑی۔ ایک جلتے ہوئے مکان کے قریب سے گزری تو مجھے باہر دو بچوں کی لاشیں نظر آئیں۔ شعلوں میں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ایک کی گردن کٹی ہوئی تھی۔ دوسرے کا پیٹ پھٹا ہوا تھا۔ میں اور تیز دوڑی۔ میرے راستے میں بہت سی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ اُن مسلمانوں کی لاشیں تھیں جنہوں نے ہندوؤں اور سکھوں سے کہا تھا کہ کوئی مسلمان اپنا ایمان تیس روپوں پر نہیں بیچے گا.....

"میں جان گئی کہ میرے گھر والے بھی مارے گئے ہیں۔ میرے لیے کوئی پناہ نہیں تھی۔ میں دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ گاؤں سے نکلی ہی تھی کہ اچانک آگے سے تین چار سکھ آ گئے اور میں ایک کے ساتھ ٹکرا گئی۔ اس نے مجھے دبوچ لیا۔ دوسرے کی آواز آئی ــــ "کیہڑی اے" ــــ انہیں فوراً پتہ چل گیا کہ میں کون ہوں..... میں اکیلی اور خالی ہاتھ اور وہ چار مرد۔ میں بہت تڑپی۔ روئی۔ چیخی۔ انہیں یہ بھی کہا کہ میں تمہاری بیٹی ہوں۔ پھر گالیاں دیں اور کہا کہ شرم کرو ایک لڑکی سے چار مرد لڑ رہے ہو مگر وہ شرم کی حدوں سے دور نکل گئے تھے۔ ایک نے مجھے کندھے پر اٹھا لیا اور چل پڑا.....

"میں شاید بیہوش ہو گئی تھی۔ سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ذرا اپنے آپ میں آئی تو وہ مجھے اسی طرح اٹھائے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کونسا گاؤں تھا جس کے ایک گھر میں وہ داخل ہوا اور مجھے ایک کمرے میں کندھوں سے اتار دیا..... پھر میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ تم سمجھ سکتی ہو بیٹی! وہ ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔ میں کیسے بتاؤں؟ کن لفظوں میں سناؤں..... سنانے کی ضرورت بھی کیا ہے..... مجھ پر غشی طاری ہو گئی۔ جب آنکھ کھلی تو میں ایک

چارپائی پر پڑی تھی ۔ دماغ چکرا رہا تھا اور جسم ٹوٹ پھوٹ گیا تھا ۔ یہ جھنڈا میرے پاس پڑا تھا ۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا ۔ کمرے کا ایک ہی دروازہ تھا ۔ اُٹھ کر ہاتھ لگایا تو باہر سے بند تھا . . . . .

"بہت دیر بعد ایک سکھ آیا ۔ میں اسے دیکھ کر چیخنے لگی ۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کا پیالہ اور روٹی تھی ۔ اس نے مجھے بٹھا کر اطمینان سے سمجھایا کہ تم یہاں سے بھاگ نہیں سکو گی ۔ صرف اتنا سا کام کرو کہ سکھ بن جاؤ اور کسی سکھ کے ساتھ تمہاری شادی کر دی جائے گی ۔ میں نے صاف انکار کر دیا ۔ اُس نے مجھے باتوں باتوں میں روٹی کھلا کر دودھ پلا دیا جس سے میرے جسم میں کچھ جان آ گئی اور دماغ سوچنے کے قابل ہو گیا مگر اس سکھ نے میرے جسم سے پھر جان نکال دی اور میرے دماغ کو بھنور کی طرح چکراتا چھوڑ کر چلا گیا ۔ باہر سے دروازے کو تالا لگا گیا . . . . .

"اس کے بعد میں چار سکھوں کا کھلونا بن گئی ۔ میں اس کمرے میں قید رہی ۔ کبھی دو سکھ آتے اور کبھی چاروں آ جاتے ۔ وہ شراب کے نشے میں بدمست ہوتے تھے ۔ کئی بار انہوں نے میرے منہ میں زبردستی شراب انڈیلی اور مجھے بے ہوش کر دیا ۔ اس لحاظ سے شراب مجھے اچھی لگتی تھی کہ میں بے ہوش ہو جاتی تھی یا میں وہ نہیں رہتی تھی جو میں تھی ۔ اس دوران وہ مجھے کہتے رہے کہ میں سکھ ہو جاؤں پھر کوئی سکھ مجھ سے شادی کر لے گا لیکن میں نے ہر بار انکار کیا اور انہیں گالیاں بھی دیں ۔ گالیوں کے جواب میں وہ قہقہے لگاتے تھے . . . . .

"مجھے دن رات کا کوئی احساس نہیں تھا ۔ نہ یہ علم کہ کتنے دن گزر گئے ہیں ۔ وہ مجھے دودھ اور گھی پلاتے رہتے تھے ۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ میں وہاں تقریباً پندرہ دن قید رہی ۔ ان سکھوں نے مجھے ایک روز کہا ——— "تم گھبراؤ نہیں ۔ یہاں تم اکیلی نہیں ہو . . . . . یہاں سے ہم نے کوئی مسلمان لڑکی پاکستان نہیں جانے دی ۔ بہت سی سکھ ہو گئی ہیں ۔۔۔

مذہب نہیں چھوڑا وہ کئی کئی سکھوں کی بیویاں بنی ہوئی ہیں ۔ تم مان جاؤ اور کسی گھر میں عزت سے رہو" ——— میرا یہی ایک جواب تھا کہ میں تم پہ اور تمہارے مذہب پر لعنت بھیجتی ہوں . . . . .

"ایک دن ایسا آیا کہ دن کے وقت صرف ایک سکھ آیا اور دودھ اور پراٹھے رکھ کر چلا گیا ۔ رات کے وقت دروازہ کھلا ۔ میرا جسم کانپنے لگا ۔ میں جانتی تھی کہ میرا کیا حشر ہو گا ۔ دروازہ کھلا ۔ بند ہوا ۔ دیا جل رہا تھا ۔ صرف ایک سکھ اندر آیا ۔ اس کی کمر کے ساتھ بڑی کرپان لٹک رہی تھی ۔ وہ اس قدر بدمست تھا کہ پاؤں رکھتا کہیں تھا پڑتا کہیں تھا ۔ اس نے قہقہہ لگایا اور بڑی ننگی بات کہی ۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کرپان اتار کر چارپائی پر رکھ دی ۔ معلوم نہیں وہ کیوں گھوما ۔ میں نے لپک کر نیام سے کرپان کھینچ لی اور اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ وہ جونہی میری طرف مڑا میں نے ہاتھ پیچھے کر کے پوری طاقت سے کرپان کی نوک اس کے پیٹ پر رکھی اور ساری طاقت صرف کر کے کرپان کو دبایا ۔ میرے اندر انتقام کی آگ تھی جو ایک طاقت بن گئی اور کرپان کوئی ایک بالشت اس کے پیٹ میں اُس جگہ اُتر گئی جہاں سے پسلیاں شروع ہوتی ہیں ۔ مجھے آج خیال آتا ہے کہ کرپان نے اُس کا دل چیر دیا تھا ۔ سکھ کی ہلکی سی آواز نکلی اور وہ کرپان کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر دُہرا ہو گیا اور میرے وار کے دھکے سے پیچھے ہٹا ۔ میں نے کرپان کو اور زیادہ دبایا اور وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے دروازے سے جا لگا ۔ میں نے کرپان کو اور زیادہ دبایا تو وہ اور اندر چلی گئی ۔ وہ ایک پہلو کی طرف گر پڑا . . . . .

"میں نے کرپان اس کے جسم میں ہی چھوڑ دی ۔ جلدی سے جھنڈا اٹھایا، سر پر لیا، دروازے کی زنجیر کھولی اور باہر نکل گئی ۔ یہ کوئی ویران مکان تھا کسی مسلمان کا ہو گا ۔ صحن کا دروازہ کھلا تھا ۔ میں نڈر ہو گئی تھی ۔ دماغ بالکل صاف ہو گیا تھا ۔ اپنی جان کی اب کوئی قیمت نہیں رہی تھی ۔ میں صحن کے دروازے سے نکلی ۔ گلی سنسان پڑی تھی ۔ معلوم نہیں وقت کیا تھا اور رات کتنی گزر گئی

تھی - مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ پاکستان کس طرف ہے - اپنا گاؤں ہوتا تو وہاں
سے مجھے معلوم تھا - اس گاؤں کی سمت کا اندازہ نہیں کر سکتی تھی - میں نے گلی
میں چلتے چلتے اپنے اللہ سے راستہ پوچھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ نے مجھے راستہ
دکھا دیا ہے - گاؤں کی گلیوں کی کچھ سمجھ نہیں تھی .....

"ابھی گاؤں میں ہی تھی کہ مجھے آگے کچھ آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں -
جگہ کھلی تھی - میں آوازوں سے چھپنے لگی - قریب درخت تھے - وہاں تک گئی
تو لکڑی کی کھرلی پڑی دیکھی جس کے نیچے لکڑی کے پہیے ہوتے ہیں - میں اس
میں لیٹ گئی - وہ آدمی میرے قریب سے گزرے - وہ سکھ تھے - وہ لوٹ مار
اور مسلمان لڑکیوں کی آبروریزی کی بڑی شرمناک باتیں کرتے جا رہے تھے - مجھے
ڈر یہ تھا کہ یہ وہی سکھ نہ ہوں جو مجھے قبضے میں رکھے ہوئے تھے - وہ کمرے
میں گئے تو فوراً میری تلاش میں نکلیں گے ..... وہ گلی میں چلے گئے تو میں
کھرلی سے نکل کر چل پڑی - میں اس ڈر سے دوڑ نہیں سکتی تھی کہ پاؤں کی آواز
کوئی سن لے گا اور دوڑنے سے شک بھی ہو گا .....

"میں گاؤں سے نکل گئی اور اللہ توکل پاکستان کا رخ کر لیا - جب گاؤں
سے بہت دور نکل گئی تو دوڑ پڑی - کھیتیوں میں پاؤں دھنستے تھے کھل
کر دوڑا نہیں جاتا تھا - اندھیرے میں دھان کے کھیت میں جا پھنسی - گھٹنوں
تک کیچڑ میں دھنس گئی - وہاں سے نکلی اور مینڈھوں پر چلنے لگی - ذرا آگے
گئی تو بدبو سے دماغ پھٹنے لگا - ایسی بدبو کسی مردار کی ہو سکتی تھی - میں مینڈھوں
پہ دوڑنے لگی اور خشک کھیتوں میں سے گزرنے لگی - ایک جگہ ٹھوکر لگی تو گر
پڑی - یہاں بدبو زیادہ تھی - میں اٹھ رہی تھی تو محسوس ہوا جیسے میں کسی مرے
ہوئے جانور یا انسان سے ٹھوکر کھا کر گری ہوں - میں نے جھک کر دیکھا تو ستاروں
کی روشنی میں مجھے ایک لاش نظر آئی - ادھر ادھر دیکھا تو بہت سی لاشیں بکھری
ہوئی نظر آنے لگیں - معلوم نہیں کتے تھے یا گیدڑ جو لاشوں کو کھا رہے تھے - وہ

مجھ سے بالکل نہ ڈرے .....

"اب یہ سن کر کیا کرو گی بیٹی کہ لاشوں کے درمیان کھڑے ہو کر میرے دل
اور دماغ کا کیا حشر ہوا ہو گا ...... پر اتنا سن لو اور دوسروں کو سنا دو کہ یہ پاکستان
کے نام پر قتل ہونے والوں کی لاشیں تھیں جن کی ہڈیاں ہندوستان کی مٹی میں مل
گئی ہیں اور جو اس پاکستان کو دیکھ بھی نہیں سکے جس کی خاطر وہ کٹ مرے اور
انہیں نہ کفن نصیب ہوا نہ قبر اور ان کا کسی نے جنازہ بھی نہ پڑھا - بیٹی! یہاں کے
لوگوں کو بتاؤ کہ جس ملک میں تم آج عیش و عشرت کر رہے ہو اس کی جڑوں میں
غریب کسانوں کی ہڈیاں دفن ہیں اور تم نے اتنی اونچی اونچی عمارتیں کھڑی کر کے
ان بدنصیبوں کو بھوکا مار دیا ہے جو اپنے بچے اور اپنی بیٹیوں کی عصمتیں پاکستان
کے نام پر قربان کر کے موت کے راستوں پر پا پیادہ چل کر یہاں پہنچے تھے .....

"پر بیٹی! تم جو جی میں آئے لکھو - میں جاہل عورت ہوں - پاکستان پاک
ملک ہے اور میں سکھوں کی ناپاک کی ہوئی عورت ہوں"

اس نے ناپاک کی جگہ بڑا ہی فحش لفظ کہا تھا جو میں لکھ نہیں سکتی، لیکن اس
لفظ میں جو طنز تھی اور جو شکوے بھرے ہوئے تھے اس کا زہر محسوس کرتی ہوں
تو جی میں آتا ہے کہ وہی لفظ لکھوں جو اس نے کہا تھا مگر "پاکستان کے پاک
لوگوں" سے ڈرتی ہوں -

اس نے کہا ——— "میں لاشوں سے ٹھوکریں کھاتی چلتی چلی گئی - میں
رات ہی رات پاکستان پہنچ جانا چاہتی تھی - اب میرے سامنے کوئی کھیتی نہیں تھی -
میں پھر دوڑ پڑی - ایک پگڈنڈی آ گئی - میں اسی پہ ہو لی - خدا کو بار بار پکارتی تھی -
اسی کی ذات کا آسرا تھا اور اسی کی ذات مجھے یقین دلا رہی تھی کہ میں ٹھیک راستے
پر جا رہی ہوں ...... دوڑتے دوڑتے ٹانگیں اکڑنے لگیں اور پیاس سے منہ کھل
گیا - چلنا بھی محال ہو گیا مگر مجھے چلنا تھا - میں چلنے لگی بلکہ پاؤں گھسیٹنے لگی - بہت
دور جا کر ایک جوہڑ نظر آیا تو اس سے پانی پیا - وہاں سے کوئی نصف کوس گئی ہوں

گی کہ اُونچی نیچی جگہ آگئی جہاں اونچی گھاس اور جھاڑیاں بہت تھیں۔ مجھے ایک عورت کی آہ وزاری اور اس کے ساتھ سکھوں کی گالیاں اور ہنسی سنائی دی۔ میں ایک جھاڑی سے لگ کر بیٹھ گئی..... عورت بلبلاتی رہی اور سکھ اس کا وہی حال کرتے رہے جو میرا ہو چکا تھا.....

"وہ مجھ سے دور [illegible] تھے۔ میں تھر تھر کانپنے لگی۔ پھر ایک سکھ کی آواز آئی ——— 'اچھے ای مُکا دیو' ——— عورت کی ہائے سنائی دی پھر سکھوں کے قدموں کی آہٹ سنائی دی جو مجھ سے دُور ہٹتی چلی گئی۔ وہ بہت دُور چلے گئے تو میں اُٹھ کر چل پڑی۔ عورت کی لاش میرے راستے میں پڑی تھی۔ وہ بے حس تھی۔ میں رُکی نہیں۔ چلتی گئی۔ دل میں کہا کہ یہ خوش قسمت ہے جو مر گئی.....

"اس کے بعد اس طرح یاد آتا ہے جیسے خواب میں چلتی رہی۔ چلتے چلتے اونگھنے لگتی اور جھٹکا سا لگتا تو میں بیدار ہو جاتی۔ پھر میں کتنی ہی دور گہری نیند کی حالت میں چلی جاتی۔ اس عورت کی لاش سے آگے مجھے بالکل یاد نہیں کہ میرے نیچے کھیتیاں تھیں یا مینڈھیں یا کانٹے تھے۔ میرا جسم چلا جا رہا تھا۔ بھوک، نیند اور پیاس کا کوئی احساس نہیں رہا تھا...... ایک جگہ میں بیدار ہوئی تو میں چل نہیں رہی تھی، زمین پر اوندھے مُنہ پڑی تھی۔ میں شاید چلتے چلتے گر پڑی تھی۔ اپنے جسم کا بوجھ اٹھانا محال ہو گیا۔ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل ہو کر اٹھنے کی کوشش کی تو بھی نہ اٹھا گیا تو میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل ہی چل پڑی۔ رات کا اندھیرا ابھی بہت گہرا تھا....

"اسی طرح چلتے چلتے میں اُٹھ کھڑی ہوئی اور ٹانگیں گھسیٹنے لگی۔ جہاں ٹانگیں بالکل شل ہو جاتیں وہاں سے میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلنے لگتی۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ میں نے کتنا فاصلہ طے کیا اور کس ہمت کی۔ اتنا یاد ہے کہ اب تو جیسے ہر قدم پر ایک لاش پڑی تھی۔ لاشیں خراب ہو رہی تھیں اس لیے بدبو بہت زیادہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

پاکستان کی محبت چلتے رہنے پر مجبور کر رہی تھی تو میں کوئی جواب نہیں دے سکوں گی.....

"مجھے وہاں تک یاد ہے کہ میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چل رہی تھی۔ جب سحر تھوڑی تھوڑی روشن ہونے لگی۔ اس ہلکی ہلکی روشنی میں مجھے چار پانچ سو گز دُور ایک گاؤں کے کالے کالے خدوخال نظر آئے اور اپنے اردگرد لاشیں ہی لاشیں دکھائی دیں۔ بچوں کی، عورتوں کی، بوڑھوں اور جوانوں کی..... لاشوں کی حالت کیا تھی؟ تمہیں نہیں سناؤں گی بیٹی! تم برداشت نہیں کر سکو گی۔ میں لاشوں میں سے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل گزرتی گئی۔ اگر کوئی مجھے وہاں دیکھتا تو یہی کہتا کہ کوئی لاش چل رہی ہے۔ میں چلتی رہی اور مجھ پر غشی یا غنودگی طاری ہونے لگی.....

"اچانک میری آنکھ کھل گئی یا شاید میں ہوش میں آگئی۔ سورج نکل آیا تھا۔ دھوپ کو دیکھتے ہی میں ڈر گئی کیونکہ میں چھپ نہیں سکتی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ میں سڑک کے کنارے پڑی تھی اور سڑک کے دونوں طرف لاشیں ہی لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ زیادہ تر لاشیں سُوج کر خراب ہو چکی تھیں اور ان میں تازہ لاشیں بھی تھیں۔ سڑک لال تھی۔ کنارے کی مٹی لال تھی اور یہ راستہ جو پاکستان کی طرف جاتا تھا خون میں ڈوبا ہوا تھا۔ دُور پاکستان کی طرف بہت سے لوگ جا رہے تھے ——— یہ مہاجروں کا قافلہ تھا اور ہندوستان کی طرف سے مجھے ٹرک آتے دکھائی دیئے۔ مجھے پہلا خیال یہ آیا کہ ان ٹرکوں میں ہندو سکھ ہوں گے اور وہ قافلے کو قتل کر دیں گے۔ فوراً مجھے اپنے قتل ہونے کا خیال آگیا۔ میں لاش کی طرح بے سُدھ لیٹ گئی.....

"ٹرک بہت تیز آ رہے تھے۔ مجھے قافلے کا پھر خیال آگیا۔ میں گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ فوراً مجھے ٹرک کی بریکوں کی آواز سنائی دی۔ میں پھر گر پڑی اور بے سُدھ ہو گئی۔ ٹرک میرے قریب آ کے رُکا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں تاکہ

وہ مجھے لاش سمجھ کر چلے جائیں مگر انہوں نے مجھے کھڑے دیکھ لیا تھا۔ مجھے ایک
آدمی نے جھنجھوڑا تو خوف سے میری آنکھ کھل گئی۔ وہ فوجی تھا۔ میں نے ہاتھ جوڑ
کر اُسے کہا کہ اگر تمہارا کوئی خدا ہے تو تمہیں اُسی کا واسطہ میرے اندر کچھ نہیں رہا۔
میں لاش ہوں۔ مجھے مردار سمجھ کر یہیں پڑا رہنے دو۔ اس کے پاس دو اور فوجی
آ گئے۔ ایک نے کہا ——— 'یار یہ زندہ ہے اسے اٹھائے چلو' ——— پھر
اس نے مجھے کہا ——— "تم مسلمان ہو نا! ہم پاکستانی ہیں۔ ڈرو نہیں۔ اُٹھو'
——— میں نے روتے ہوئے کہا ——— 'مجھ بے بس اور بے آسرا
کو دھوکا نہ دو کافر! میں تو مر رہی ہوں'......

"وہ شاید سمجھ گئے تھے کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ تینوں نے مجھے اٹھا لیا۔
میرا جسم تو لکڑی ہو گیا تھا۔ وہ مجھے ٹرک کی پچھلی طرف لے گئے تو مجھے اس کے
پیچھے تین اور ٹرک نظر آئے۔ تمام ٹرک انسانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان پر
کوئی چھت نہیں تھی۔ مجھے ٹرک میں ڈالنے لگے تو کسی نے کہا کہ سوئی کی بھی جگہ
نہیں ہے۔ آگے لے جاؤ۔ وہ مجھے اگلی سیٹ پر لے گئے اور بٹھا دیا۔ ایک
فوجی باہر لٹک گیا، دوسرا میرے ساتھ بیٹھ گیا اور تیسرا ڈرائیور کے دائیں طرف
اٹک گیا۔ میرے ساتھ بیٹھنے والے نے مجھے کہا ——— 'بہن! برا نہ منانا جگہ
نہیں ہے اور ہم جلدی میں ہیں' ——— اس کے منہ سے بہن کا لفظ سنا تو
یکلخت میرے آنسو بہہ نکلے اور میں ہچکیاں لینے لگی۔ اپنے بھائیوں کی پناہ میں
آکر سارے روگ آنسو اور ہچکیاں بن گئے۔ فوجیوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا،
تسلیاں دیں، بہت کچھ کہا لیکن میں بے قابو ہو کر روتی ہی رہی۔ جسم کی حالت
بہت ہی بری تھی۔ روتے روتے مجھ پر غشی طاری ہو گئی۔ مجھے اتنا ہی یاد ہے
کہ روتے روتے میرا سر ایک طرف ڈھلکا تو میرے پاس بیٹھے ہوئے فوجی
نے میرا سر اپنے کندھے پر رکھ کر میری پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا تھا...... تم تو
بعد میں پیدا ہوئی ہو گی۔ اُن دنوں اپنی بلوچ رجمنٹ کا نام بہت مشہور ہوا تھا۔

یہ رجمنٹ بڑی دلیری سے مہاجروں کو اُدھر سے لائی تھی اور اس رجمنٹ نے
بہت سکھ مارے تھے۔ یہ اسی رجمنٹ کے آدمی تھے.....

"مجھے لاہور کے ریفیوجی کیمپ میں ہوش آئی۔ یہ والٹن کیمپ تھا....
ڈاکٹر دوائیاں دیتے رہے جن سے میری حالت سات آٹھ دنوں میں اچھی ہو
گئی اور ایک روز اچانک میرا باپ مل گیا۔ اس نے بتایا کہ میرا سارے کا سارا
کنبہ صحیح وسلامت لاہور پہنچ گیا ہے۔ جب ہمارے گاؤں پر حملہ ہوا تو یہ لوگ
مجھے دو تین آوازیں دے کر فوراً نکل آئے تھے اور ہماری برادری کے چار اور
گھرانے بھی نکل آئے تھے۔ باقی سب گاؤں میں شہید ہو گئے تھے۔ مجھ سے
جو کوئی پوچھتا کہ میں کہاں رہی اور کس طرح پہنچی تو میں اصل بات بتا دیتی۔
بعد میں مجھے محسوس ہوا کہ میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے......

"اس کا احساس مجھے ڈیڑھ ایک سال بعد ہوا۔ ہمیں ایک گاؤں میں
مکان مل گیا اور کافی زمین بھی مل گئی۔ کچھ مالی مدد بھی مل گئی۔ میرا باپ اور بھائی
بہت محنتی تھے۔ انہوں نے قریب ہی بنجر اور ویران زمین کو بھی کاشت کے
قابل بنا لیا۔ اس طرح زمین بہت ہو گئی۔ برادری کے دوسرے گھرانے بھی
اسی گاؤں میں آباد ہوئے اور اس گاؤں میں ہماری تحصیل کے کچھ اور گھرانے
آباد ہو گئے۔ ہماری زندگی نئے سرے سے رواں ہو گئی۔ یوں سمجھ لو دو اڑھائی
سال بعد۔ پھر جوان لڑکیوں کی شادیوں کی طرف توجہ دی گئی۔ سب مہاجر تھے۔
ابھی جہیز دینے کے قابل کوئی بھی نہ تھا۔ بڑی سادگی سے ساری لڑکیاں بیاہی
گئیں۔ میں اکیلی رہ گئی......

"لیکن مجھے کوئی ایسا غم نہ تھا کیونکہ اپنے گاؤں میں پاکستان بننے سے
پہلے میری منگنی ہو چکی تھی۔ صرف دن مقرر کرنے باقی تھے مگر یہ مصیبت آن پڑی۔
میرا منگیتر آ گیا تھا اور یہاں موجود تھا۔ بس اس لیے چپ تھی کہ اس کے ماں
باپ ابھی تیار نہیں ہوں گے......

"ایک دن پتہ چلا کہ چار روز بعد میرے منگیتر کی شادی ایک اور گھرانے میں ہو رہی ہے۔ اس کی شادی ہو گئی۔ تب ایک کانٹا میرے سینے سے ہی ہل کر میرے دل میں اتر گیا اور میں سمجھ گئی کہ مجھے کس گناہ کی سزا دی جا رہی ہے۔

پھر بھی میں نے ماں سے پوچھا کہ انہوں نے (منگیتر کے والدین نے) اس کی شادی وہاں کیوں کر دی ہے؟ میری ماں نے غصے سے جواب دیا ——— "تو سکھوں کی چھوڑی ہوئی ہے نا، اس لیے ..... تو یہ بات دل میں رکھتی کہ دیتی کہ کہیں چھپی رہی اور ایک قافلے کے ساتھ آگئی ..... ماں بہت روئی اور اس نے بتایا کہ وہ چوری چھپے لڑکوں والوں کے تین گھروں سے بات کر چکی ہے۔ ہر گھر سے یہی جواب ملا ہے کہ تمہاری لڑکی داغدار ہے ....

"یہ داغ مجھے لے کے بیٹھ گئے۔ پورا ایک سال اور گزر گیا۔ میں نے تو شادی کا خیال ہی دل سے نکال دیا تھا مگر گھر والوں کا رویہ بھی بدل گیا۔ باپ نے حکم دیا کہ بھائیوں کے ساتھ کھیتوں میں چلی جایا کروں۔ گھر میں ڈھور ڈنگر میرے سپرد کر دیئے گئے۔ محنت مشقت کا جو کام مرد کرتے تھے وہ مجھے مردوں کے ساتھ کرنے کو دیا گیا۔ پھر میرے ایک بھائی کی شادی ہو گئی تو دلہن نے بھی گھر والوں کا رویہ دیکھ کر مجھے نوکرانی سمجھ لیا۔ گھر والوں کے لیے اب میں بوجھ بن گئی۔ اس کے ساتھ ہی مجھ پر کڑی نظر بھی رکھی جانے لگی۔ ذرا ادھر ادھر ہوتی تو ماں ڈھونڈنے لگتی۔ کھیتوں میں جاتی تو شام کو ماں باپ بھائیوں سے تصدیق کرانے کہ میں کہیں گئی تھی یا نہیں کتنی دیر وہاں رہی اور میں کس وقت پہنچی تھی .....

"ایک روز میں کھیتوں سے آتے ایک سہیلی کے پاس رک گئی۔ ذرا دیر ہو گئی۔ گھر آئی تو ماں نے ایسی ایسی بیہودہ باتیں کہیں کہ میں جل اٹھی۔ ماں مجھے اندر لے گئی اور کہنے لگی ——— "بے حیا! اپنے باپ کی سفید پگڑی کو داغ نہ لگا دینا۔ تیرا کیا جائے گا۔ تو تو پہلے ہی داغی ہے۔ اپنے بھائیوں کے

سر نیچے نہ کر دینا۔ تیری ڈولی تو اٹھے گی نہیں، جنازہ ہی اٹھے گا" ———

اس روز میرے منہ میں بھی جو آیا میں نے بک ڈالا۔ بڑے بھائی نے سنا تو اس نے مجھے تین چار تھپڑ مارے۔ ہو سکتا ہے انہیں غصہ ان پر ہو جو مجھے داغدار سمجھ کر ٹھکرا چکے تھے مگر وہ ان کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔ میں ان کے سامنے تھی، سارا غصہ مجھ پر نکلتا تھا .....

"میرے لیے اپنا گھر دوزخ بن گیا۔ گاؤں دوزخ بن گیا۔ ایسے لگتا جیسے گاؤں کی دیواریں بھی کہہ رہی ہوں ——— "بے حیا! تو داغدار ہے۔ گناہگار ہے۔ سکھوں کی چھوڑی ہوئی ہے" ——— میں پناہ ڈھونڈنے لگی جو مجھے کہیں بھی نہ ملی۔ گاؤں کا بندہ بندہ دشمن نظر آنے لگا۔ شاید میں نے ہی سہیلیوں سے ملنا چھوڑ دیا تھا لیکن ایسے لگتا تھا جیسے سکھی سہیلیاں بھی مجھ سے نفرت کرتی ہیں۔ مجھے اب خاوند کی نہیں پناہ کی ضرورت تھی ..... میں ایک رات اللہ کے حضور بہت روئی اور اس سے پوچھا کہ تو ہی بتا میرے اللہ، میں سکھوں کے پاس خود گئی تھی یا وہ اس لیے مجھے ذلیل کرتے رہے کہ میں تیرا نام لینے والی لڑکی تھی ..... میں نے اپنے اللہ سے بڑے غصے میں باتیں کیں .....

"اور دوسرے دن میرے اللہ نے مجھے پناہ دے دی۔ سبب یہ بنایا کہ مجھے اکیلے ہی کھیتوں میں جانا پڑا۔ کھیت گاؤں سے دور تھے۔ ایک بھینس کتوں سے بدک کر بھاگ اٹھی۔ اس کے پیچھے گئی تو میں بہت دور نکل گئی۔ بھینس کو میں نے روک لیا۔ دم لینے کے لیے درختوں تلے بیٹھ گئی۔ یہ راستہ تھا۔ ایک آدمی فوجی وردی میں چلا آ رہا تھا۔ قریب آیا تو وہ مجھے دیکھنے لگا اور میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ مجھے وہ فوجی یاد آ گئے جو مجھے ادھر سے لاشوں میں سے اٹھا لائے تھے۔ میرے سارے دکھ ایک مسکراہٹ بن گئے اور میں اسے دیکھتی رہی۔ قریب آ کر وہ آہستہ ہو گیا۔ میں اسے پھر بھی دیکھتی رہی ....

"بیٹی! تم مجھے بے حیا کہو لیکن میں کہہ چکی ہوں کہ مجھے خاوند کی نہیں پناہ

کی ضرورت تھی ۔ مجھے فوجیوں نے ہی پناہ دی تھی ۔ اب ایک فوجی نظر آیا تو ایسے لگا کہ اب بھی مجھے یہ فوجی پناہ میں لے لے گا ۔ اس نے شاید میری نظریں بھانپ لی تھیں ۔ جوان آدمی تھا ۔ بولا ——— "تم شاید مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو" ——— میں بالکل نہ جھجکی ۔ میں نے اُسے بتایا کہ مجھے اُدھر سے فوجی کس طرح اٹھا لائے تھے اور اس وجہ سے مجھے فوجی اچھے لگتے ہیں ۔ اس نے پوچھا ——— "کونسا گاؤں تھا تمہارا ؟" ——— میں نے بتایا تو وہ میرے پاس بیٹھ گیا ۔ اس نے اپنے گاؤں کا نام بتایا ۔ اس کا گاؤں ہمارے گاؤں سے سات آٹھ کوس دور تھا ۔ وہ بھی مہاجر تھا ۔ اب یہاں ایک گاؤں میں اسے ہماری طرح مکان اور زمین مِل گئی تھی ۔ فوج نے قریب ہی کہیں کیمپ لگایا تھا ۔ یہ آدمی ایک دن کی چھٹی لے کر اپنے گاؤں جا رہا تھا . . .

"اُس نے کوئی ایسی ویسی بات نہ کی نہ کوئی نازیبا کلمہ مُنہ سے نکالا ۔ میں نے اُسے یہ سُنانے سُنانے کہ فوجی مجھے کِس طرح اٹھا لائے تھے، یہ بھی سُنا دیا کہ مجھ پر وہاں کیا بیتی ہے ۔ میں رو پڑی ۔ اس نے کہا ——— "تمہارے بھائی اور باپ بڑے بے غیرت ہیں جو تمہیں وہاں اکیلا چھوڑ آئے تھے ۔ میری دو بہنیں ہیں ۔ دونوں کو اپنے ساتھ لایا تھا ۔ راستے میں بیوی ماری گئی تھی ۔ اس کے پیٹ میں ہمارا پہلا بچّہ تھا" ——— میں نے اس کی باتوں میں ہمدردی اور خلوص کی جھلک دیکھی تو اسے یہ بھی بتا دیا کہ گاؤں میں اور گھر میں میرا کیا حشر ہو رہا ہے اور اب میں ساری عمر کے لیے دھتکاری گئی ہوں . . . . . میں بہت روئی اور اسے بتایا کہ مجھے خاوند کی ضرورت نہیں، اب ایک ہی خواہش ہے کہ کسی ایسی جگہ جا چھپوں جہاں کوئی مجھے داغدار اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی نہ کہے . . .

"میری جذباتی باتوں نے اس پر گہرا اثر کیا ۔ وہ سوچ میں پڑ گیا ۔ پھر اس نے میرے باپ کا نام پوچھا اور گاؤں پوچھا اور وہ یہ کہہ کر چلا گیا ——— "جو مولا کرے گا" ——— اُس دن میں گھر میں داخل ہوئی تو مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی ۔

میں بہت دیر باہر رہی تھی ۔ تھوڑے دنوں بعد دو اجنبی عورتیں ہمارے گھر آئیں ۔ چار پانچ روز بعد میری ماں میری ایک خالہ کو ساتھ لے کر اُن کے گاؤں گئی ۔ جب وہ واپس آئیں تو بہت خوش تھیں ۔ ماں نے مجھے خوش خبری سنائی کہ فلاں گاؤں میں میری بات پکی ہو گئی ہے اور میرا ہونے والا خاوند فوج میں ہے ۔ یہ وہی فوجی تھا جس نے چند دن پہلے میرے پاس بیٹھ کر میری بپتا سُنی تھی . . . . .

"میری شادی ہو گئی اور جنازے سے پہلے میری ڈولی اٹھی ۔ میں یہ جھنڈا اپنے کپڑوں کے ساتھ لے گئی اور ابھی تک سنبھالے ہوئے ہوں ۔ شادی کو بیس سال گزر گئے ہیں ۔ پہلا بچّہ اٹھارہ سال کا ہے ۔ دوسرا چودہ سال کا اور تیسرا آٹھ سال کا ۔ ان کا باپ شادی کے چوتھے سال ایک پاؤں سے معذور ہو گیا تھا ۔ اس کا پاؤں بارودی سُرنگ پر آ گیا تھا ۔ کہیں مشق کر رہے تھے ۔ اس سے ایک پاؤں ٹخنے سے صاف اُڑ گیا ۔ اسے تھوڑی سی پنشن ملتی ہے اور کچھ اپنا کام دھندا کرتا ہے"

"اور اس کی زمین جو اُسے الاٹ ہوئی تھی ؟"

"یہ ایک اور کہانی ہے ۔ اس کے بھائیوں نے باپ کے مرنے کے بعد ایسی استادی کھیلی کہ ساری زمین اپنے نام رجسٹری کرا لی ۔ دعوے مقدمے بھی ہوئے مگر کچھ نہ بنا ۔ بھائیوں نے اسے قتل کرنے کی دو دفعہ کوشش کی لیکن بے چارہ ایک پاؤں سے معذور تھا، یہی بہتر جانا کہ گاؤں ہی چھوڑ دو"

اُس نے آہ بھری اور کہا ——— "بیٹی، بس یہ ہے میری بپتا لیکن یہ مجھ اکیلی کی نہیں ۔ میں نے سُنا ہے کہ مجھ جیسی بہت سی لڑکیوں کے ساتھ یہی سلوک ہوا تھا . . . . . اب تم جانو، تمہارے پڑھنے سننے والے جانیں ۔ جو جی میں آئے مجھے کہو ——— داغدار کہو، گناہ گار کہو ۔ میں مان لوں گی ۔ کسی کے منہ پر ہاتھ نہیں رکھوں گی لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ پاکستان کے جھنڈے میں میری عصمت کا خون شامل ہے اور اس جھنڈے سے کھیلنے والوں سے کہو کہ

بے غیرتو! تم اپنی ہزاروں بیٹیوں کی عصمتوں سے کھیل رہے ہو، اور یہ نہ بھولو کہ عصمت کا خون شہید کے خون جتنا پاک ہوتا ہے۔ وہ دن آنے والا ہے، جب یہ خون سر چڑھ کر بولے گا۔۔۔"

میں اٹھی تو وہ میرے ساتھ چل پڑی۔ کہنے لگی —— "مجھے ہر اگست میں سانپ ڈستا ہے۔ یہ سانپ میرے وجود کے اندر ہے، میرے دل کے اردگرد کُنڈلی مارے بیٹھا رہتا ہے۔ اگست کا مہینہ آتا ہے تو یہ مجھے ڈسنے لگتا ہے۔ چوبیس اگست گزر گئے ہیں۔ پچیسواں آرہا ہے اور میں ادھ موئی ہوئی جارہی ہوں۔ کسی کو اپنا روگ سُنا نہیں سکتی۔۔۔۔ یہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے خاوند ایسا دیا جو میرے روگ کو سمجھتا ہے اور میرے زخموں کو سہلا لیتا ہے۔۔۔۔۔ اللہ اسے لمبی زندگی دے۔۔۔۔۔ اللہ پاکستان کو تاقیامت سلامت رکھے۔۔۔"

میں اس کے گھر سے دُور چلی آئی تو بھی مجھے اس کے الفاظ سنائی دیتے رہے —— "عصمت کا خون شہید کے خون جتنا پاک ہوتا ہے۔۔۔۔ اللہ پاکستان کو تاقیامت سلامت رکھے۔"

ایک آنکھ اور پاکستان

یہ کہانی قوم کی اُن بیٹیوں میں سے ایک بیٹی کی داستانِ جہاد ہے جو جنگِ آزادی میں ہمارے دوش بدوش لڑی تھیں۔

یہ بیٹی پنجاب کی تھی اور میں جو اس کی داستان کا ایک اہم کردار ہوں، ہندوستان کے اُن مسلمانوں میں سے تھا جنہیں معلوم تھا کہ ان کے علاقے پاکستان میں شامل نہیں ہوں گے، پھر بھی انہوں نے قیامِ پاکستان کے لیے تن من اور دھن کی قربانیاں دیں اور ہندوؤں نے اُن کے گھر اور خاندان تباہ کر دیئے۔

کہانی سنانے سے پہلے قیامِ پاکستان کا مختصر سا پس منظر بیان کرنا ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے بہت سے نوجوانوں کو اس پس منظر سے واقفیت نہیں۔ انگریزوں اور ہندو لیڈروں نے یہ تو تسلیم کر لیا تھا کہ مسلمان پاکستان سے کم کچھ بھی قبول نہیں کریں گے اور ملک کی تقسیم ضروری ہو گئی ہے لیکن انہوں نے پاکستان کو کم سے کم علاقے دینے کی سکیم تیار کر لی بلکہ پاکستان میں آنے والے صوبوں میں بھی یہ پیچ ڈال دی کہ ان کے باشندے فیصلہ کریں کہ وہ پاکستان میں شامل ہوں گے یا ہندوستان میں رہیں گے۔ ہمارے دو اہم صوبوں پنجاب اور بنگال کو تو انہوں نے تقسیم کی سکیم میں ہی آدھا آدھا کر دیا تھا۔ اس طرح مسلم اکثریت کے بہت سے علاقے جو تقسیم کے طے شدہ اصول کے مطابق پاکستان کے تھے، ہندوستان کو دے دیئے گئے۔

اس کے علاوہ انگریزوں نے ہندوؤں کے گٹھ جوڑ سے شمال مغربی سرحدی صوبہ، بلوچستان اور اُدھر سلہٹ آسام کے متعلق یہ حکم جاری کیا کہ وہاں ریفرنڈم (عوام کی رائے شماری) ہوگا کہ یہ صوبے پاکستان کو ملیں یا ہندوستان کو۔ بلوچستان میں لوگوں کو نہیں جرگے کو فیصلہ کرنا تھا۔

سلہٹ وغیرہ کے لوگوں کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ بنگالی مسلمانوں کا ذہن صاف تھا۔ یہ بنگالی جنہیں ۱۹۷۱ء میں غدار کہا گیا تھا، غدار نہیں تھے، نہ جنگِ آزادی میں انہوں نے دھوکہ دیا نہ جنگِ دسمبر ۱۹۷۱ء میں۔ صوبہ سرحد کے پٹھانوں کے جذبۂ حریت کے متعلق بھی کوئی شک نہیں تھا۔ سرحد کے یہ رائفل بردار مجاہدین ایک سو سال سے انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے مگر وہاں یہ کمزوری پیدا ہوگئی تھی کہ صوبائی حکومت کانگرس کی تھی اور دو بہت بڑے غدار بھائی —— غفار خاں اور ڈاکٹر خان —— ہندوؤں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔ قبائلی پٹھانوں کے لیے یہ دونوں مجسّم دھوکہ بنے ہوئے تھے۔ ان دُور دراز اور دُشوار گزار علاقوں میں انہوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ مہاتما گاندھی مسلمان ہے۔ غفار خان اپنے آپ کو سرحدی گاندھی کہلاتا تھا۔

ہندوؤں نے اس صوبے کو ہندوستان میں شامل کرنے کے لیے اپنے خزانے لٹا دیئے تھے۔ ان کے پاس دولت تھی۔ مالی لحاظ سے مسلمان کمزور تھے۔ اصل کمزوری بیان کر چکا ہوں کہ وہاں حکومت کانگرس کی تھی۔ یہ وہ خطرے تھے جو صوبہ سرحد پر منڈلا رہے تھے۔ اگر یہ صوبہ پاکستان سے کٹ جاتا، تو افغانستان اور ہندوستان پاکستان کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جاتے بلکہ پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ جاتا۔

ذرا انگریزوں کی دھاندلی پر غور کیجئے۔ سرحد مسلم اکثریت کا صوبہ تھا۔ اکثریت بھی ایسی کہ ہندو اور سکھ آٹے میں نمک کے برابر تھے، مگر اس میں ریفرنڈم ہو رہا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انگریزوں اور ہندوؤں نے درپردہ کوئی ایسا انتظام کر رکھا

ہے کہ وہ یہ صوبہ لے جائیں گے۔ لہٰذا قائد اعظم اور مسلم لیگ کے لیے یہ صوبہ بہت بڑا چیلنج بن گیا تھا۔

میں اُس وقت دلّی میں تھرڈ ائیر کا سٹوڈنٹ تھا۔ ہم میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ والد صاحب دلّی میں مرکزی حکومت میں سپرنٹنڈنٹ تھے، اس لیے ہم ان کے ساتھ دلّی رہتے تھے۔ والد صاحب نظریۂ پاکستان کے شیدائی تھے۔ باپ کا جو نظریہ تھا اس سے بیٹے کس طرح منحرف ہو سکتے تھے۔ ہمارے والد صاحب بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہم اُس جگہ (میرٹھ) کے رہنے والے ہیں جہاں ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں نے جنگِ آزادی کی ابتدا کی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ مسلمان اس جنگ میں ناکام ہوگئے تھے لیکن آزادی کی چنگاری بجھی نہیں۔

میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ مجھے انہوں نے بے جا پیار کے ذریعے بگاڑا نہیں۔ مجھے لڑکپن سے ہی جہادِ آزادی کے سبق کہانیوں کی شکل میں دینے لگے تھے۔ وہ انگریزوں کے ملازم تھے لیکن اس قوم سے سخت نفرت کرتے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ سانپ پر اعتبار کر لینا، انگریز یہودی اور ہندو پر کبھی بھروسہ نہ کرنا۔ اگر ان میں سے کوئی بھی دوستی کا ہاتھ بڑھا کر تمہارے قریب آئے تو دو قدم پیچھے ہٹ جاؤ کیونکہ اس نے اپنے پاس خنجر چھپا رکھا ہوگا۔

۱۹۴۶-۴۷ء میں جب جنگِ آزادی فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوگئی، میرے والد صاحب زمین دوز طریقے سے سرگرم ہوگئے۔ طلباء کا اپنا محاذ تھا۔ میں اس پر شامل ہوگیا۔ ہم جانتے تھے کہ دلّی پاکستان میں شامل نہیں ہوگا لیکن ہم انگریزوں کو شکست دے کر برِصغیر میں اسلامی مملکت قائم کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ ہمیں ہندو طلبا اور پروفیسر وغیرہ بڑے پیار سے کہا کرتے تھے کہ تمہیں ہمارے ساتھ رہنا ہے پاکستان بن بھی گیا تو دلّی اس میں شامل نہیں ہوگا، پھر تم کیوں غیر مسلموں کی دُشمنی مول لیتے ہو۔ آؤ اور کانگرس کا محاذ مضبوط کرو۔

ہم میں سے کوئی بھی ان کے اثر میں نہ آیا تو ہمیں دھمکیاں دی گئیں، جن میں

کالجوں سے نکال دینے کی دھمکیاں بھی شامل تھیں۔ ہم کالجوں سے تو نکل ہی چکے تھے۔ تعلیم سے توجہ ہٹ گئی تھی۔ ہم تو اپنے ماں باپ کے زیرِ اثر بھی نہیں رہے تھے۔ ہم مسلم لیگ کے دفتر سے حکم لیتے تھے اور شب و روز اس دفتر میں یا اس دفتر کے احکام بجا لاتے گزرتے تھے۔

ہم اس لیے بھی مستعد اور چوکنّے رہتے تھے کہ قائدِاعظم کا ہیڈ کوارٹر دِلّی میں تھا۔ انہیں ہماری حفاظت کی ضرورت تو نہیں ہوتی تھی، لیکن ہم سمجھتے تھے جیسے ہمارے سوا ان کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں۔ ہمارے بعض ساتھی قائدِاعظم کی کوٹھی کے اردگرد اس طرح گھومتے پھرتے رہتے تھے جیسے انہیں پہرہ دینے کا حکم دیا گیا ہو۔ قائدِاعظم کہیں جاتے تو لڑکے ان کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچ جاتے اور انہیں بتائے بغیر ان کے محافظ بنے رہتے تھے۔ ان لڑکوں کے پاس چاقو ہوا کرتے تھے۔ ہمارا ایک دوست عبدالمتین جو ایک جاگیر دار کا بیٹا تھا، اپنی ٹانگ کے ساتھ پتلون کے اندر گولیوں سے بھرا ہوا ریوالور باندھ کر رکھا کرتا تھا۔

پاکستان کے نام پر ۱۹۴۶ء میں جو الیکشن ہوئے تھے، اس میں مرکز کی تمام مسلم سیٹیں جن پر ہندو بھی قابض رہا کرتے تھے، مسلمانوں نے جیت لیں۔ یہ ہندوؤں کی بہت بڑی شکست تھی۔ اس فتح نے قائدِاعظم کی جان کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ ان پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا بھی جو کسی ہندو نے نہیں ایک مسلمان نے کیا اور مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں غدّاری کی جو روایات قائم کی ہیں انہیں تازہ کیا۔

یہ بہت بڑی خوش نصیبی تھی کہ قائدِاعظم اس حملے سے بچ گئے لیکن حملہ آور کی بھی خوش نصیبی تھی کہ اسے پولیس نے اپنی حوالات میں بند کر دیا تھا ورنہ دلّی کے نوجوانوں کی جذباتی حالت یہ تھی کہ وہ حملہ آور کو قیمہ کر دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

دِلّی کے نوجوانوں نے قیامِ پاکستان کے لیے جو جہاد کیا اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ کہوں گا کہ قوم کے وقار کے پاسبان نوجوان

ہوتے ہیں بشرطیکہ انہیں نصب العین دیا جائے۔ اگر نصب العین یہ دیا جائے کہ فلاں اچھا اور فلاں بُرا ہے اور نوجوانوں کو اپنے مخالفین کو ذلیل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے جو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ کیا آپ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ اب نوجوانوں، خصوصاً طلبار کو پاکستان کے استحکام اور دفاع کے لیے نہیں بلکہ کرسی کے حصول اور دفاع کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے؟

پنجاب میں مسلمانوں نے تقریباً تمام سیٹیں جیت لیں۔ اس کے مطابق وہاں مسلم لیگ کی وزارت بننی چاہیئے تھی مگر انگریز بادشاہ نے بے اصولی اور مسلم دشمنی کا انتہائی گھٹیا مظاہرہ کیا۔ مسلم لیگ کو وزارت کی تشکیل کی دعوت دینے کی بجائے اپنے ایک پٹھو خضر حیات ٹوانہ (یونینسٹ پارٹی) کو وزیرِ اعلیٰ بنا دیا جس نے اپنی پارٹی اور کانگرس اور سکھوں میں وزارتیں تقسیم کر دیں۔ اس کے خلاف مسلمانوں نے تحریک شروع کر دی جو باقاعدہ معرکہ بن گئی۔ اس میں خواتین بھی شامل ہو گئیں۔ ہر روز جلوس نکلتے، لاٹھی چارج ہوتے، آنسو گیس چھوڑی جاتی اور گرفتاریاں ہوتی تھیں۔

آپ "حکایت" میں اس تحریک کی کئی کہانیاں پڑھ چکے ہیں۔ آپ تفصیلات سے واقف ہوں گے، اس لیے میں انہیں دُہرانا نہیں چاہتا۔ صرف یہ کہوں گا کہ طلبار نے تعلیم ترک کر دی تھی اور خواتین بھی میدان میں آ گئی تھیں۔ یہ اسی دور کا واقعہ ہے کہ ایک لڑکی نے سیکرٹریٹ میں گورنر کے دفتر پر سبز جھنڈا لہرا دیا تھا۔ ضلع کچہری اور کئی ایک سرکاری عمارتوں پر پولیس کے سخت انتظامات اور اپنی جان کے خطرے کے باوجود لڑکیوں نے سبز جھنڈے لہرائے تھے۔

سارے پنجاب میں یہ تحریک چل رہی تھی۔ اس کا مرکز لاہور تھا۔ اس چونتیس روزہ تحریک میں مسلمانوں نے خصوصاً نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے جس ڈسپلن، ایثار اور جذبے کے مظاہرے کیے ہیں، یہ ہماری تاریخ کا درخشاں باب

ہے مگر یہی وہ باب ہے جو ہم اپنے آج کے نوجوانوں سے چھپائے ہوئے ہیں۔ میں پروین کی کہانی آج کے نوجوانوں کو سنا رہا ہوں۔

اس تحریک کے دوران بے شمار ڈرامائی کہانیوں نے جنم لیا ہے۔ خاندانوں میں چپقلش بھی ہوئی ہے۔ طلاقیں بھی ہوئیں اور منگنیاں بھی ٹوٹی ہیں مثلاً بیوی مسلم لیگی ہے مگر سسرال والے انگریز کی عطا کی ہوئی جاگیر یا پنشن کی وجہ سے یونینسٹ پارٹی کے حامی ہیں یا کسی بھی پارٹی میں نہیں۔ انہوں نے بہو کو مسلم لیگ سے ہٹانا چاہا۔ بہو نہ مانی۔ اس کے والدین تک بات پہنچی۔ وہ بھی نہ مانے۔ بات بڑھی اور طلاق ہو گئی۔ ایسی قربانیاں دینے والی عورتیں آج بھی زندہ ہیں جو اپنے خاوندوں سے اس لیے الگ ہو گئی تھیں کہ خاوند نظریۂ پاکستان کے خلاف تھے۔

میری کہانی یوں ہے کہ میں دلّی میں تھا۔ ہمیں علی گڑھ سے اطلاع ملی کہ وہاں کی یونیورسٹی کے بہت سے سٹوڈنٹ لاہور جا رہے ہیں۔ کچھ چلے بھی گئے تھے۔ وہ ٹوانہ کے خلاف تحریک میں شامل ہونے کے لیے گئے تھے۔ ہمیں اطلاع دینے کا مقصد یہ تھا کہ دلّی سے بھی جو لڑکے اپنے خرچ پہ لاہور جا سکتے ہیں جائیں۔ اس کے متعلق سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لاہور میدانِ جنگ بنا ہوا تھا۔ پنجاب میں چونکہ اخباروں پر سنسر کی پابندی تھی، اس لیے ہمیں وہاں کی جو خبریں ملتی تھیں وہ مسلم لیگ کے اپنے ذرائع سے ہم تک پہنچتی تھیں۔

لاہور سے افواہیں بھی دلّی پہنچتی تھیں۔ یہ اُدھر سے دلّی آنے والے مسافر سنایا کرتے تھے۔ ہمارے بعض ساتھی دلّی ریلوے سٹیشن پہ چلے جاتے اور لاہور سے آنے والے مسافروں سے وہاں کی خبریں پوچھتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ لاہور میں باقاعدہ معرکہ آرائی ہو رہی تھی مگر بعض لوگ رائی کا پہاڑ بناتے تھے۔ ہم تک ایسی زبانی خبریں بھی پہنچیں کہ فلاں دن لاہور میں پولیس نے مسلمانوں کے جلوس پہ [illegible] گولیاں [illegible] کی ہیں اور سینکڑوں مسلمان شہید ہو گئے ہیں۔ خواتین کی

بے حرمتی کی خبریں بھی ملتی تھیں۔

ہمارا نوجوان خون کھولتا تھا۔ ہمارے لیے خواتین کی بے حرمتی قابلِ برداشت نہیں تھی۔ ہم میں سے کوئی بارہ لڑکے لاہور جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ مجھے والد صاحب نے اجازت دے دی۔ ہمیں لاہور مسلم لیگ کے صوبائی دفتر میں جانا تھا۔ ہم نے اپنی تعلیم اور مستقبل کو خیرباد کہا اور لاہور پہنچ گئے۔ وہ تو جیسے فوجی ڈسپلن اور انتظام تھا۔ مسلم لیگ کے دفتر میں ہماری رہائش کا انتظام کیا گیا لیکن ہوا یوں کہ لاہور کے لڑکوں نے باہر کے لڑکوں کو تقسیم کر لیا اور انہیں اپنے اپنے گھر لے گئے۔

علی گڑھ کے لڑکے پہلے ہی آئے ہوئے تھے۔ میں ان سب سے ملا۔ ہم لاہور میں پردیسی تھے۔ میں نے پہلی بار لاہور دیکھا تھا مگر لاہور کے لڑکوں نے اور لڑکیوں نے بھی ہمیں پردیس کا احساس نہ ہونے دیا۔ پہلے ہی دن اجنبیت ختم ہو گئی تھی۔

میں جس کے حصّے میں آیا وہ اندرونِ لاہور میں رہتا تھا۔ میں اس کے گھر کی نشان دہی نہیں کرنا چاہتا۔ اس کا نام محمد عمر تھا۔ کوئی تین سال ہوئے، مجھے کراچی میں ایک دوست نے اطلاع دی تھی کہ غربت اور مسائل نے اُسے اس حد تک پہنچا دیا تھا کہ حرکتِ قلب بند ہو جانے سے فوت ہو گیا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ موت نے عمر کو شکست دی ہو گی۔ وہ تو پہاڑوں سے ٹکرانے والا نوجوان تھا مگر پاکستان بنانے والے مجاہد کو پاکستان کے حالات نے جینے کے قابل نہ چھوڑا۔

وہ پہلے روز مجھے اپنے گھر لے جا رہا تھا تو راستے میں کہنے لگا "اصغر یار! تم تو امیر باپ کے بیٹے معلوم ہوتے ہو۔ تمہیں میرا گھر پسند نہیں آئے گا۔ ہم کوئی امیر لوگ نہیں ہیں۔"

"عمر بھائی!" ـــــ میں نے اُسے چلتے چلتے روک کر کہا ـــــ "میں تمہارے گھر کا معائنہ کرنے نہیں آیا۔ تم جانتے ہو میں کیوں آیا ہوں۔ ہم ...

کوئی بھی امیر اور غریب نہیں۔"

میں جب اُس کے محلے میں داخل ہوا تو مکانوں کی ساخت اور اینٹوں نے مجھے مغلوں کا دَور یاد دلا دیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ عزم پختہ ہو گیا کہ ہمیں پاکستان بنانا ہے۔ اگر میں یہاں سیر کے لیے آیا ہوتا تو عمر جن گلیوں میں مجھے لے جا رہا تھا وہاں سے میں بھاگ جاتا۔ میں نے ایسا محلہ اور ایسے مکان کبھی نہیں دیکھے تھے اور میں نے اتنی تنگ گلیاں بھی کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ مکان اتنے اُونچے جیسے اوپر جا کر ایک دوسرے سے مل گئے ہوں۔ بدبو بھی تھی۔ میں فراخ اور صاف ستھرے علاقے میں رہنے کا عادی تھا مگر ان گلیوں کو میں نے ناپسند نہ کیا۔ میں کسی اور مقصد کے لیے آیا تھا۔ یہی مقصد ذہن پہ سوار تھا۔

عمر کا مکان نیچے والی منزل میں تھا۔ کمرے تنگ اور تاریک لیکن عمر غریب باپ کا بیٹا نہیں تھا۔ یہ متوسط درجے کا گھرانہ تھا۔ عمر تھرڈ ایئر کا سٹوڈنٹ تھا۔ گھر میں معمولی سی قسم کی کرسیاں اور چارپائیاں تھیں۔ چھت کے ساتھ جالے اور دیواروں پر نمی کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ یہ مکان رہنے کے قابل نہیں تھا۔ اگر میں یہاں اکیلا رہتا تو شاید مجھے اس سے ڈر بھی آتا لیکن اس مکان میں ایک تقدّس تھا۔ بخدا آج بھی یہ مکان یاد آتا ہے تو ذہن میں زیارت کا تصوّر آ جاتا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ وہاں جاؤں اور سجدہ کروں۔ یہ تقدس ایک تو عمر کی وجہ سے تھا اور اس کی والدہ، والد اور دو بھائیوں کے خلوص اور پیار کی وجہ سے بھی۔

اس کنبے نے مجھے اپنے گھر کا فرد بنا لیا۔ غیریّت اور اجنبیت نہ رہی۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ میں پنجابی نہیں بول سکتا۔ اب تو کوئی مانتا ہی نہیں کہ میری مادری زبان اردو ہے مگر یہ [illegible] ہیں، مجھے عمر کے گھرانے کا پیار دیکھ کر شرم آتی تھی کہ میں ان لوگوں کی زبان نہیں بول سکتا۔ عمر کی ماں مجھے "اصغر پتر" کہا کرتی تھی۔ "پتر" میں جو مٹھاس اور دلی پیار تھا وہ مجھے "اصغر بیٹا" میں

نظر نہیں آتا تھا۔

عمر کے والد صاحب میرے والد صاحب کی طرح پاکستان کے نام پہ جان قربان کرتے تھے۔ جلوسوں اور مظاہروں میں شامل ہوتے اور عمر سے دن بھر کی رپورٹ لیتے تھے کہ لڑکوں نے آج کیا کیا ہے۔ میں آپ کو اُس دَور اور آج کے دَور میں ایک فرق بتاتا ہوں۔ تحریک پاکستان میں جب لڑکے جلوس میں شامل ہونے کے لیے جاتے تھے تو مائیں انہیں دُعاؤں کے ساتھ رخصت کرتیں اور باپ فخر سے سر اونچے کرتے تھے۔ مجھے والد صاحب نے دلّی سے لاہور بھیج دیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ لاہور میں کیا ہو رہا ہے۔ عمر کے والد صاحب تو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ لڑکے زخمی ہوتے ہیں، گرفتار بھی ہوتے ہیں اور مارے بھی جا سکتے ہیں لیکن وہ اپنے بیٹے کی طرح مظاہروں میں شامل ہوتے اور عمر کی حوصلہ افزائی کرتے تھے مگر آج یہ فرق پیدا ہو گیا ہے کہ میرے بیٹے کالج جاتے ہیں تو مجھے فکر رہتا ہے کہ کسی جلوس میں نہ جا شامل ہوں۔ آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ آج کے دَور کی سیاست بازی سے طلبا اور طالبات کے والدین کیوں خائف ہیں۔

اسی محلّے کی تین لڑکیاں تھیں جو خاصی سرگرمی سے تحریک میں حصّہ لے رہی تھیں۔ انہی میں پروین بھی تھی۔ یہ تینوں متوسط گھرانوں کی لڑکیاں تھیں۔ تینوں میٹرک پاس کر چکی تھی۔ والدین نے انہیں کالج میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی تھی۔ البتہ انہیں مسلم لیگ کے شعبۂ خواتین میں کام کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ ان کے کرنے کے بہت سے کام تھے۔ یہ جلوسوں میں بھی شریک ہوتی تھیں۔

ہم جو دلّی، میرٹھ اور علی گڑھ سے آئے تھے، مختلف کام کرتے تھے۔ اُن دنوں زیادہ کام مظاہروں کا تھا۔ ایک کام یہ بھی تھا کہ ہر روز ان افراد کو تیار کرنا ہوتا تھا جنہیں اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کرنا ہوتا تھا۔ ان کی گرفتاری کے بعد ان کے گھروں کی دیکھ بھال بھی لڑکوں کے ذمّے تھی۔ لڑکیاں بھی ان کے گھروں میں جاتی تھیں۔

کئی لڑکیاں شام کے بعد تک کام کرتی تھیں ۔ انہیں لڑکے اپنی حفاظت میں ان کے گھروں تک چھوڑ آتے تھے ۔ پروین اور اس کی دو ساتھی لڑکیاں چونکہ عمر کے محلّے میں رہتی تھیں اس لیے ان کی حفاظت میرے اور عمر کے ذمے تھی ۔ اُن دنوں خطرہ یہ تھا کہ شام کے بعد خنجر زنی کی وارداتیں شروع ہو جاتی تھیں ۔ ہندو اکیلے دکیلے مسلمان کو دیکھ لیتے تو اُسے خنجر مار کر بھاگ جاتے تھے ۔ ایسی ایک واردات پروین اور اس کی ایک سہیلی کے ساتھ ہو چکی تھی ۔ یہ میرے لاہور آنے سے پہلے کا واقعہ ہے ۔

اُس روز پروین کے ساتھ ایک ہی لڑکی تھی ۔ دونوں شام کے بعد تک مُسلم لیگ کے دفتر میں مصروف رہیں ۔ انہیں گھر پہنچانے کے لیے دو لڑکے ساتھ گئے ۔ اُس روز جلوس پر بڑا شدید لاٹھی چارج ہوا تھا جس سے بہت سے آدمی زخمی ہو گئے تھے ۔ ان دونوں لڑکوں کو دفتر واپس جانے کی جلدی تھی ۔ وہ لڑکیوں کی گلی میں پہنچے تو انہوں نے لڑکیوں سے کہا کہ انہیں واپسی کی جلدی ہے ۔ لڑکیوں نے انہیں کہا کہ وہ پہنچ گئی ہیں ، اب کوئی خطرہ نہیں ۔ وہ واپس چلے جائیں ۔ لڑکے چلے گئے ۔

اس گلی میں دور پیچھے ایک بلب روشن تھا ۔ لوگ شام کو ہی گھروں کے دروازے بند کر لیتے تھے ۔ پروین کو اپنے پیچھے پاؤں کی دبی دبی سی آہٹ سنائی دی اور اپنے اوپر پڑتا سایہ بھی دکھائی دیا ۔ اس نے پیچھے دیکھا کہ ایک آدمی ہاتھ اُوپر کیے ہوئے تھا اور اس ہاتھ میں خنجر تھا ۔ وہ پروین کی سہیلی پر وار کرنے لگا تھا ۔ اُس کا ہاتھ اُٹھ چکا تھا ۔ دو تین سیکنڈ میں خنجر کو لڑکی کی پیٹھ میں اُتر جانا تھا ۔ پروین کو ڈر کر بھاگ جانا چاہیے تھا لیکن اس نے اُچھل کر اس آدمی کے پہلو پر اِس طرح لات ماری کہ اس کا دایاں پاؤں اس آدمی کے پہلو پر پڑا ۔ وہ یقیناً ہندو تھا ۔ وہ پروین کی لات کی ضرب اور دھکے سے دیوار کے ساتھ جا لگا ۔
پروین کی سہیلی چیخ مار کر گھومی ۔ حملہ آور کے گھٹنے زمین سے لگے تھے ۔ پروین نے اُسے

ایک اور ٹھڈ مارا جو اس کی گردن پر لگا ۔ وہ تیزی سے اُٹھا اور بھاگ گیا ۔ یہ پروین کی بہت بڑی دلیری تھی ، ورنہ اس قسم کی صورت حال میں مرد بھی گھبرا جاتے ہیں اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ سوچ سکیں ، حملہ آور وار کر کے غائب ہو چکا ہوتا ہے ۔ اس واقعہ کے بعد لڑکے لڑکیوں کو ان کے گھروں میں داخل کر کے واپس آتے تھے ۔

مَیں اور عمر ان لڑکیوں کو کئی بار اپنے ساتھ گھر لائے ۔ وہ پاک وقت تھا ۔ جوان لڑکیاں اور لڑکے اکٹھے رہتے ، گھومتے پھرتے اور شام کے بعد اکٹھے گھروں کو جاتے تھے ۔ کبھی کوئی ایسی شکایت سُننے میں نہیں آئی تھی کہ کسی لڑکے نے کسی لڑکی کے ساتھ بدتمیزی کی ہو ۔ یہ تینوں لڑکیاں مجھ میں زیادہ دلچسپی لیتی تھیں ۔ وجہ یہ تھی کہ وہ مجھے مہمان سمجھتی تھیں ۔ مَیں انہیں کہا کرتا تھا کہ وہ میرے ساتھ پنجابی بولا کریں ۔ میں ان کے ساتھ پنجابی بولنے کی کوشش کیا کرتا تھا ۔ میری اُردو پنجابی زبان کا حلیہ بگاڑا کرتی تھی ۔ یہ ان لڑکیوں کو بہت اچھا لگتا تھا ۔ کبھی کبھی تو یوں نظر آتا تھا جیسے ہم موت کے ساتھ مذاق کر رہے ہیں ۔

حالات روز بروز خراب ہوتے جا رہے تھے ۔ پولیس کا تشدد بڑھتا جا رہا تھا ۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ پولیس جن لڑکوں کو گرفتار کر کے لے جاتی ہے ، ان پر وہ بہت تشدد کرتی ہے ۔

انگریزوں نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے اور مسلمانوں کا حق ہضم کرنے کے لیے ظالموں کی طرح مسلمانوں پر تشدد کیا ۔ قوم نے خوب مقابلہ کیا اور کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کیا ۔ ہمیں دن اور رات کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا ۔ ایک جنون تھا جو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا ۔

اس دوران دن کے وقت پروین کے ساتھ کبھی کبھی اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کا موقع ملا ۔ پروین بڑی اچھی شکل و صورت کی لڑکی تھی ۔ ذہین اور خوش طبع بھی تھی ۔ اس کی منگنی ہو چکی تھی ۔ اس کے ہونے والے سُسرال لاہور سے تھوڑی دور کے ایک قصبے کے رہنے والے تھے ۔ وہ مطمئن تھی کہ گھرانہ بھی اچھا اور لڑکا بھی اچھا ہے ۔

ایک روز اُس نے مجھے کہا ـــــ "میں تمہاری شادی لاہور کی کسی لڑکی سے کرادوں گی"۔

میں نے ہنس کر کہا کہ مجھے پنجابی اتنے اچھے لگتے ہیں کہ میں پنجابی لڑکی کو ہی پسند کروں گا۔

اُس نے جذباتی سے لہجے میں کہا ـــــ "اگر ہم پاکستان حاصل کرلیں پھر میری شادی ہوتو مجھے روحانی تسکین ہوگی۔ میں فخر سے کہا کروں گی کہ میں نے آزادی میں شادی کی ہے۔ میرے بچے اپنے آزاد ملک میں پیدا ہوں گے"۔

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا ـــــ "انشاءاللہ ایسے ہی ہوگا"۔

ہم نے یہ معرکہ مارلیا۔ انگریزی حکومت نے ہتھیار ڈال دیئے۔ خضر حیات ٹوانہ کی وزارت توڑ دی گئی۔ سکھوں کے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے اپنی کرپان لہرا کر مسلمانوں کو للکارا اور اُس نے یا اس کے کسی ساتھی نے یہ الفاظ کہے ـــــ

"جو مانگے گا پاکستان۔ اُس کو دیں گے قبرستان"۔

تحریک ختم ہوگئی مگر اس کے ساتھ ہی پروین کی خوشیاں بھی ختم ہوگئیں۔ میں نے تحریک کے آخری دن اُسے نہ دیکھا۔ مصروفیت اور سرگرمیاں ایسی تھیں کہ اس کا خیال بھی نہ آیا۔ تحریک ختم ہوئی تو ہم سب نے فاتحانہ سکون کا سانس لیا۔

میں نے پروین کی سہیلیوں سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ تین چار روز پہلے لڑکیاں جلوس میں شامل ہونے کے لیے جارہی تھیں۔ وہ نسبت روڈ سے گزر رہی تھیں۔ کسی ہندو نے دُور سے لوہے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لڑکیوں کو مارا۔ یہ ٹکڑا پروین کی آنکھ میں لگا۔ لڑکیوں پر دو پتھر بھی آئے۔ ایک پتھر تو دُور گرا۔ ایک پتھر سے ایک لڑکی زخمی ہوگئی۔ پروین کو ایک مسلمان ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ اُس نے یہ بُری خبر سنائی کہ پروین کی آنکھ ضائع ہوچکی ہے۔ اُسے میو ہسپتال داخل کردیا گیا تھا۔

ہم جو لڑکے باہر سے آئے تھے، واپس جانے لگے تو میں عمر کے ساتھ میو ہسپتال

چلا گیا۔ پروین کی آنکھ پر پٹی بندھی تھی۔ ڈاکٹر اس کی آنکھ کا اپریشن کرکے ڈھیلا نکال چکا تھا۔ پروین ایک آنکھ سے محروم ہوچکی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی مگر یہ مسکرانے کی ناکام کوشش تھی۔

"تم نے آزادی کے لیے بہت بڑی قربانی دی ہے"۔ میں نے اس کے دل کو سہارا دینے کے لیے کہا۔

"وہ بھی تو ہیں نا، جنہوں نے جانیں قربان کردی ہیں" ـــــ اس نے کہا ـــــ "ایک آنکھ کی قربانی تو کوئی قربانی نہیں"۔

اُس کی ماں اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اپنی بچی کو دیکھ رہی تھی اور اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ عمر نے اس کی ماں کو اشارہ کیا۔ میں پروین کو خدا حافظ کہہ کر عمر کے ساتھ وارڈ سے باہر آگیا۔ پروین کی ماں بھی ساتھ آئی۔

"خالہ جی!" ـــــ عمر نے پروین کی ماں سے کہا ـــــ "آپ پروین کے سامنے نہ رویا کریں۔ آپ نے سُنا نہیں پروین نے کیا کہا ہے؟ جوان لڑکے شہید ہوگئے ہیں۔ آپ کی بیٹی زندہ تو ہے"۔

"تم ابھی بچے ہو" ـــــ ماں نے کہا ـــــ "خدا نے میری بیٹی کی صرف ایک آنکھ کی نہیں، ساری عمر کی خوشیوں کی قربانی لی ہے۔ میں اس کے مستقبل پر رو رہی ہوں۔ میری اتنی خوبصورت بیٹی کا چہرہ بگڑ گیا ہے"۔

"اس کا کچھ بھی نہیں بگڑا خالہ جان"! ـــــ میں نے کہا ـــــ "آپ ایسے غم نہ لگالیں جن کی کوئی بنیاد نہیں"۔

"میں نے دنیا دیکھی ہے" ـــــ وہ کہتی ہوئی وارڈ میں چلی گئی ـــــ "تم نادان ہو"۔

میں دلّی چلا گیا۔ میں چونکہ آپ کو جنگِ آزادی کی تاریخ نہیں سنانا چاہتا اس لیے بہت سے واقعات نہیں سناؤں گا۔ ۳ جون ۴۷ء کے روز میرے آبائی شہر میرٹھ میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے شہیدوں اور غازیوں کے

نعروں کی گونج سنائی دی —— ملک کی تقسیم کا اعلان ہوگیا —— مگر یہ پاکستان تو صرف نامکمل ہی نہیں تھا بلکہ اس میں سے مزید علاقے کاٹ لینے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ یہ تھا صوبہ سرحد، بلوچستان اور سلہٹ کا ریفرینڈم۔

قائداعظم نے حکم دیا کہ زیادہ سے زیادہ مسلم لیگی لیڈر اور ورکر صوبہ سرحد چلے جائیں اور ریفرینڈم کو اپنے حق میں کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ صوبہ سرحد میں کیا کیا خطرات تھے۔

اس موقعہ پر بھی علی گڑھ، میرٹھ اور دلّی کے سٹوڈنٹ پشاور پہنچ گئے۔ ہمارے لیڈروں نے بھی پشاور کو مرکز بنا لیا۔ پشاور کے ایڈورڈ کالج اور اسلامیہ کالج کے مسلمان سٹوڈنٹ پہلے ہی سرگرم تھے۔ ہم ان کے ساتھ مل گئے۔ ہم بنوں، کوہاٹ، ٹانک اور قبائلی علاقوں تک گئے۔ شہروں میں ہم گھر گھر پھرے۔ میں نے دیکھا وہاں کانگرس کے اثرات موجود تھے۔ خصوصاً قبائلی علاقے میں سرحدی گاندھی کے پیروکار بھی تھے۔

اللہ نے ہمارا یہ جہاد بھی قبول کر لیا اور صوبہ سرحد پاکستان کے حصے میں آ گیا۔ بلوچستان میں جرگے نے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کر دیا۔ اُدھر مشرقی پاکستان کے لوگوں نے سلہٹ کو پاکستان میں شامل کر لیا۔ انگریزوں اور ہندوؤں کے عزائم خاک میں مل گئے۔

باہر سے آئے ہوئے سٹوڈنٹ واپس جانے لگے۔ میرے دل میں لاہور کی اور عمر کے گھر کی اتنی محبت تھی کہ میں نے اپنے دلّی کے ساتھیوں سے کہا کہ وہ دلّی چلے جائیں اور میرے گھر بتا دیں کہ میں چند دن لاہور رہ کر آؤں گا۔ میں نے انہیں احتیاطاً عمر کے گھر کا ایڈریس دے دیا۔ اب ہم فارغ تھے۔ فاتح تھے۔ میں تھک کر چور ہو گیا تھا۔ کچھ دن فراغت میں گزارنے کا ارادہ تھا۔ عمر کے گھر میں جو خلوص، پیار اور سکون تھا، وہ مجھے آگے نہیں جانے دے رہا تھا۔ اس گھر سے نکلے چھٹا مہینہ گزر رہا تھا۔ مجھے پروین کا بھی خیال آیا لیکن اس سے ملنے

کی امید نہیں تھی کیونکہ اس کی منگنی کبھی کی ہو چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی شادی ہو چکی ہوگی۔

میں لاہور گاڑی سے اترا اور سیدھا عمر کے گھر پہنچا۔ عمر گھر نہیں تھا۔ اس کی والدہ تھی۔ اس نے مجھے گلے لگایا اور میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر بولی —— "میں تے سمجھیا سی اصغر پتر سانوں بھُل گیا ہووے گا"۔

میں اس عظیم ماں کو نہ اُس وقت بھولا تھا، نہ آج بھولا ہوں۔ اُس دور میں ہم سب کی مائیں عظیم تھیں۔ عظیم تو آج کی مائیں بھی ہیں لیکن حالات ایسے اور سیاست ایسی ہو گئی ہے کہ آج کی ماں کی عظمت پر خوف طاری ہو گیا ہے۔ کوئی ماں اپنے بچے کو کرسی کے ہنگامے کی نذر نہیں کرنا چاہتی۔ میرے بچوں کی ماں پر بھی یہی خوف سوار رہتا ہے۔

عمر کی ماں کی ساری باتیں یاد ہیں۔ کبھی کبھی تحریک کے دوران ہم اُسے مظاہروں اور پولیس کے تشدّد کی باتیں سنایا کرتے تھے۔ اس نے ایک روز مجھ سے پوچھا —— "عمر ڈرتا تو نہیں؟"

"نہیں خالہ جان"! —— میں نے اسے جواب دیا —— "آپ کا بیٹا بڑا دلیر ہے۔ یہ تو موت سے بھی نہیں ڈرتا"۔

اس نے سکون کی آہ بھر کر کہا —— "میرا پُتر شیر اے۔ اے کسے کولوں نئیں ڈردا" —— اس نے ذرا رُک کر کہا —— "اے تے میرے کولوں وی نئیں ڈردا"۔

عمر آیا۔ ہم بچھڑے ہوئے بھائیوں کی طرح ملے۔ اِدھر اُدھر کی گپ شپ ہو چکی تو عمر نے پروین کے متعلق ایسی خبر سنائی کہ میں کانپ اُٹھا۔

"تمہیں معلوم ہوگا کہ پروین کی منگنی ہو چکی تھی" —— اُس نے بتایا۔

"اُس کے سسرال شادی کے لیے کہہ رہے تھے لیکن پروین نے اپنے والدین سے منوا لیا تھا کہ شادی تحریک ختم ہونے تک ملتوی رکھیں۔ تحریک کے

دوران ہی پروین کی آنکھ نکل گئی۔ اس کے سسرال اسے ہسپتال دیکھنے آتے تھے۔ پٹی کھلنے تک ان کا رویہ ٹھیک رہا۔ پٹی کھلی۔ پروین گھر آئی اور اس کی ہونے والی ساس اسے دیکھنے آئی۔ وہ واپس چلی گئی اور آٹھ دس روز بعد پتہ چلا کہ اس عورت نے اپنے بیٹے کا رشتہ کہیں اور سے لے لیا ہے۔ چند دنوں بعد شادی بھی ہو گئی۔ پروین بیٹھی دیکھتی رہی۔ میں نے اُسے دیکھا ہے۔ اس کی آنکھ بند ہو کر اندر کو دھنس گئی ہے۔ اُسے لوہے کا جو ٹکڑا لگا تھا، اس نے آنکھ کے نیچے بھی زخم کر دیا تھا۔ اس کا نشان بھی بھدا لگتا تھا۔ اس نقص نے اس کی منگنی توڑی ہے"۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ عمر نے بتایا کہ پروین کی اس منگنی سے پہلے دو اور گھروں نے اس کا رشتہ مانگا تھا۔ اس کے والدین نے جواب دے دیا تھا۔ اب منگنی ٹوٹ گئی تو پروین کی ماں نے مجبور اور پریشان ہو کر ان میں سے ایک لڑکے کے والدین کو در پردہ پیغام بھیجا کہ وہ پروین کا رشتہ لے لیں۔ انہوں نے ایسا جواب بھیجا جس میں انتقامی طنز تھی۔

دوسرے لڑکے کے گھر پیغام بھیجا۔ اُدھر سے جواب ملا —— "ابھی تو اس کی ایک آنکھ نکلی ہے۔ دوسری بھی نکل جانے دیں تو ہم رشتہ لے لیں گے"

میں حیران ہوا کرتا ہوں کہ میدان میں دُشمن کو شکست دینے والی اور ایسی ایسی قربانیاں دینے والی قوم جس کی کوئی مثال پیش نہ کر سکے، چار دیواری کی دنیا میں آکر اس قدر سنگدل اور تنگ نظر ہو جاتی ہے جیسے یہ وحشیوں کی قوم ہے۔ پروین کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے جو راہوں میں کھڑے رہتے تھے انہوں نے بھی نظریں پھیر لیں۔ اس کے رشتے کے جو خواہشمند تھے وہ بھی بیگانے ہو گئے۔

"اور اب پروین شادی کے بغیر ہی ساری عمر کے لیے بیوہ ہو گئی ہے"۔ عمر نے کہا۔

"عمر بھائی!" —— میں نے کہا —— "یہ قربانی تم نہیں دے سکتے؟ تمہیں بھی تو شادی کرنی ہے۔ کیا ایک آنکھ کم ہو جانے سے یا چہرہ ذرا سا بگڑ جانے سے عورت کی قدر و قیمت ختم ہو جاتی ہے؟ کیا پروین جیسی مجاہدہ کوڑا کباڑ بن گئی ہے"؟

"تم شاید یقین نہ کرو اصغر!" —— اُس نے کہا —— "میں اپنے ماں باپ سے بات کرنے سے پہلے پروین کے باپ سے ملا اور اُسے کہا کہ میں پروین کے ساتھ شادی کرنے کو تیار ہوں۔ میں نے اس سے بات کرنا اس لیے ضروری سمجھا تھا کہ مجھے کچھ شک تھا کہ وہ نہیں مانے گا"۔

"مانے گا کیوں نہیں"؟

"اس لیے کہ ہماری ذات کمتر ہے"۔ عمر نے جواب دیا —— "ہم لوہار ہیں۔ تم جانتے ہو کہ میرا باپ لوہے کے ایک کارخانے میں کام کرتا ہے۔ یہ ہمارا آبائی پیشہ ہے۔ یہی ہماری ذات بن گئی ہے، میں نے تعلیم اس لیے حاصل کی ہے کہ خاندان کو ذات پات کے چکر سے نکال سکوں ...... میرا خدشہ صحیح ثابت ہوا۔ پروین کے باپ نے مجھے جواب دیا —— "ہم بھٹی ہیں۔ تم جانتے ہو تمہاری ذات کیا ہے! میں بیٹی کو گھر بٹھا کر بوڑھی کر دوں گا، اپنے سے نیچے والی ذات کو رشتہ نہیں دُوں گا۔ میں تو برادری سے باہر بھی رشتہ نہ دوں گا" —— میں خاموشی سے واپس آگیا"۔

انگریز جیسی شہنشاہ طاقت کی غلامی کی بیڑیاں توڑنے والی قوم اپنے ہی بنائے ہوئے رسم و رواج کی زنجیریں آج تک نہیں توڑ سکی اور ہر روز معصوم جذبات کا کشت و خون ہو رہا ہے۔ بعض گھروں میں نتائج اس سے زیادہ بھیانک بھی ہوتے ہیں۔

ایک تو پروین کو اپنی آنکھ نے اجاڑا۔ دوسرے باپ نے ذات پات کا قفل لگا کر باہر کے رشتے کے لیے دروازہ بند کر دیا۔ عمر کو افسوس تھا کہ وہ پروین کی مدد نہ کر

سکا لیکن اُس نے اس مسئلے کو ذہن سے نکال دیا۔ میری جذباتی کیفیت کچھ اور ہو گئی۔ مجھے اُسی وقت احساس ہو گیا کہ میں پروین کو ذہن سے نہیں اتار سکوں گا۔ عمر اُسی کی کوئی بات سنا رہا تھا لیکن میں بڑی گہری اور تلخ سوچوں میں گم ہو گیا تھا۔

اس مسئلے کا ایک ہی علاج تھا کہ میں اس کے ساتھ شادی کر لوں لیکن میرے سامنے ایک رکاوٹ یہ تھی کہ میری منگنی ہو چکی تھی۔ یہ لڑکی مجھے پسند تھی اور میں اُسے پسند تھا۔ میں یہ قربانی دے سکتا تھا مگر سب سے بڑی رکاوٹ پروین کے باپ نے پیدا کر رکھی تھی۔

میں عمر کے منع کرنے کے باوجود پروین کے گھر چلا گیا۔ دروازہ پروین نے کھولا۔ مجھے دروازے میں کھڑا دیکھ کر وہ چونک پڑی۔ اُس نے خراب آنکھ پر دوپٹہ ڈال رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر اداسی تھی۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی اچھی بھلی آنکھ جو مجھے نظر آ رہی تھی اس سے آنسو بہنے لگے۔

"میں تمہارے اباجان سے ملنے آیا ہوں"۔ میں نے کہا۔

"گھر میں کوئی بھی نہیں" —— اس نے کہا —— "اکیلی ہوں۔ اندر آ جاؤ۔ میں تمہیں زیادہ دیر بٹھا نہیں سکوں گی۔ لوگ باتیں بناتے ہیں"۔

مجھے اندر نہیں جانا چاہیئے تھا لیکن میری نیت کچھ اور تھی۔ ارادہ کچھ اور تھا۔ میں اندر چلا گیا اور بے تکلفی سے اُس کی خراب آنکھ سے دوپٹہ ہٹا دیا۔ اس کا چہرہ ان لوگوں کے کام کا نہیں رہا تھا جو لڑکی دیکھ کر شادی کیا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ لڑکی لاکھوں میں ایک ہے۔ چاند کو شرماتی ہے۔ بیٹھی ہوئی، بند اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھ اور اس کے نیچے زخم کے داغ نے اتنے حسین چہرے کی ساری کشش ختم کر ڈالی تھی۔

"تم پر جو گزری ہے وہ میں عمر سے سن آیا ہوں" —— میں نے کہا۔ "اچھا ہوا تم اکیلی مل گئی ہو۔ میں تمہارے اباجان سے تمہارا رشتہ مانگنے آیا ہوں"۔

"عمر بھی آیا تھا"۔ اس نے کہا —— "اسے میرے اباجان نے معلوم

نہیں کس لہجے میں جواب دیا تھا۔ وہ چلا گیا تو اباجان بہت دیر اُسے بُرا بھلا کہتے رہے تھے"۔

"کیا کہتے تھے"؟

"کہتے تھے کہ کالج میں دو جماعتیں پڑھ کر سمجھتا ہے کہ اس کی ذات ہماری ذات کے برابر ہو گئی ہے۔ پھر گالیاں دیتے رہے۔ پھر غصے سے مجھے کہنے لگے —— اگر تو گھر بیٹھی رہتی تو تیرا یہ حال نہ ہوتا۔ آج تیری وجہ سے میری یہ بے عزتی ہوئی ہے کہ لوہاروں کا بیٹا تیرا رشتہ مانگنے آیا ہے —— ان کا خیال ہے کہ میں اپنی غلطی سے زخمی ہوئی ہوں اور ان کا دماغ اتنا اونچا ہے کہ لوہاروں کو یہ اچھوت سمجھتے ہیں..... مجھے اس کا کوئی غم نہیں کہ میں ٹھکرائی گئی ہوں اور مجھے اب کوئی بھی قبول نہیں کر رہا۔ مجھے غم یہ کھا رہا ہے کہ مجھے ماں بھی کبھی کبھی طعنہ دے دیتی ہے اور باپ بھی کہ میں اپنی غلطی سے زخمی ہوئی ہوں اور ان کے لیے مسئلہ بن گئی ہوں"۔

"مجھے بھی تمہارے اباجان یہی جواب دیں گے جو انہوں نے عمر کو دیا تھا"؟ — میں نے کہا —— "اگر مسئلہ ذات کا ہی ہے تو میری ذات تم سے کم نہیں"۔

"نہ بات کرنا" —— اُس نے جواب دیا —— "وہ کہیں گے کہ ہم برادری سے باہر رشتہ نہیں دیتے۔ تم تو اتنی دُور کے رہنے والے ہو..... تم چلے جاؤ اصغر! محلے والے معلوم نہیں کیا باتیں بنائیں"۔

"مجھے کہیں اور مل سکو گی"؟

"آ جاؤں گی" —— اس نے ذرا سوچ کر کہا —— "عمر کے گھر آ سکتی ہوں۔ تم جاؤ..... یہ یاد رکھنا اصغر! میرے اباجان سے بات نہ کرنا۔ پریشان ہو جاؤ گے۔ میں تمہاری قربانی کی کوئی قیمت نہیں دے سکتی۔ اتنا کر سکتی ہوں کہ جہاں بلاؤ گے وہاں آ جاؤں گی"۔

اس کے ساتھ اگلی ملاقات چار پانچ روز بعد عمر کے گھر میں ہوئی۔ عمر کی ماں

کو پتہ نہ چل سکا کہ پروین میرے پاس بیٹھی ہے۔ پروین نے مجھ سے پوچھا کہ میں کتنے دن لاہور رہوں گا۔

"صرف تمہارے لیے رکا ہوا ہوں"۔۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔۔ "تم نے کہا تھا کہ میں تمہارے ابا جان سے بات نہ کروں لیکن میں اُن کے ساتھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔"

"نہیں اصغر"! ۔۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔۔ "اگر میرے ابا مان گئے تو بھی میں تمہاری یہ قربانی قبول نہیں کروں گی۔"

"قربانی کیسی"؟ ۔۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔۔ "تم کوڑھی یا اپاہج نہیں ہو۔ دِق کی مریض نہیں ہو۔ پاگل نہیں ہو۔ صرف ایک آنکھ نہ رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑ گیا۔"

"مجھے محلے اور برادری کی عورتوں نے یہ تاثر دیا ہے کہ میں اب کسی مرد کے قابل نہیں رہی اور میں دھتکاری گئی ہوں۔" ۔۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "محلے کی عورتیں ہمارے گھر آتی ہیں تو ہمدردی کے پردے میں ایسے ایسے تیر چلا جاتی ہیں جو مجھے راتوں کو سونے بھی نہیں دیتے۔ کوئی کہتی ہے کہ گھر میں محلے کی بچیوں کو قرآن پڑھایا کرو۔ کوئی کہتی ہے کہ کسی سکول میں نوکری کر لو۔ یہ پہاڑ جیسی جوانی گھر بیٹھے کس طرح گزرے گی۔ میں بچیوں کو قرآن بھی پڑھا سکتی ہوں، سکول میں نوکری بھی کر سکتی ہوں، مگر مجھے یہ مشورے ایسے انداز سے دیئے جاتے ہیں جیسے مجھے اب معاشرہ بھی قبول نہیں کرے گا اور میں کوئی گناہ کر بیٹھی ہوں جس کا کفارہ ادا کرنے کے لیے مجھے مشورے دیئے جا رہے ہوں۔۔۔۔۔

"میری سہیلیوں نے مجھے بتایا ہے کہ محلے کی عورتیں یہ بھی کہتی ہیں کہ یہ گھومنے پھرنے والی لڑکی ہے، اس کی شادی نہ ہوئی تو یہ خراب ہو جائے گی۔ ایک آنکھ ضائع ہونے سے کسی کی بیوی نہیں بن سکتی، ویسے جوان اور خوب صورت تو ہے۔ یہ باپ کی عزت ڈبوئے گی۔"

ان تنگ و تاریک گلیوں اور کمروں میں زندگی گزارنے والی عورتوں کو ایک دلچسپ موضوع مل گیا تھا۔ ان تنگ و تاریک محلوں میں ہی یہ کچھ نہیں ہوتا، اچھے اچھے علاقوں میں بڑے مکانوں اور کوٹھیوں میں رہنے والوں کی ذہنیت بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ کسے موضوع اور تماشہ بنا لیا گیا ہے۔ یہ اُن دنوں کا واقعہ ہے جب پاکستان بننے میں چند دن باقی تھے۔ لاہور میں خنجر زنی کی وارداتیں ہو رہی تھیں۔ پہلے ہندو اکیلے دکیلے مسلمان کو دیکھ کر قتل کر دیتے تھے۔ اب مسلمانوں نے بھی جوابی کارروائی کے طور پر اکیلے دکیلے ہندوؤں پر حملے شروع کر دیئے تھے۔ مجھے ایک دو ہندوؤں کو قتل کرنے کا بہت شوق تھا۔ میں اور عمر دو تین راتیں چاقو لیے گلیوں میں شکار کی تلاش میں گھومتے پھرتے رہے مگر کوئی شکار نہ ملا۔

ہندوستان میں کئی جگہوں سے مسلمانوں کے قتلِ عام کی خبریں ملنے لگی تھیں۔ مختلف سرکاری محکموں کے ملازموں سے پوچھا گیا تھا کہ وہ پاکستان میں رہنا چاہتے ہیں یا ہندوستان میں۔ ہندوستان سے پاکستان آنے والے سرکاری ملازموں کو ۱۴ اگست سے پہلے ہی ریل کے ذریعے پاکستان بھیجا جانے لگا تھا۔ ان میں سے ایک ریل گاڑی کے نیچے ہندوؤں نے بم رکھ دیا تھا جو پھٹا اور کچھ جانی نقصان ہوا تھا۔

دلی میں مرکزی دفتر کے جو مسلمان ملازم پاکستان آ رہے تھے، ان کی بھی الگ ریل گاڑی آئی تھی اور انہیں کراچی لے گئے تھے۔ وہاں معمولی اور سیدھی سیدھی سی بارکیں کھڑی کر کے ان میں مرکزی حکومت کے دفاتر بنائے گئے تھے۔

میں نے لاہور اترتے وقت اپنے دوستوں کے ہاتھ والد صاحب کے گھر کا ایڈریس لکھ دیا تھا کیونکہ حالات مخدوش ہوتے جا رہے تھے۔ یہ ضرورت ایک دوسرے کو اطلاع دینے کی ضرورت تھی۔ میرا بھیجا ہوا ایڈریس میرے کام آ گیا۔ مجھے دلی سے والد صاحب کا خط ملا کہ وہ دلی سے کراچی جا رہے ہیں۔ سارا سارا خاندان کراچی آ رہا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ میں اب دلی نہ جاؤں۔

چھ سات روز بعد کراچی سے والد صاحب کا خط آیا۔ سب لوگ خیریت سے آ گئے تھے۔ انہوں نے کراچی کا ایڈریس لکھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ میں کراچی آ جاؤں۔ میں کراچی جانے کی تیاری کرنے لگا۔ ایک تو عمر ابھی اور رکنے کو کہ رہا تھا، دوسرے پروین میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی تھی اس لیے میں چند دن اور لاہور رک گیا۔

اس دوران پروین کے ساتھ میل ملاقات رہی۔ وہ جب بھی ملتی، مجھے سناتی تھی کہ اس کے ساتھ گھر والوں کا اور محلے کی عورتوں کا رویہ کیا سے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ اس پر طنز تو کوئی نہیں کرتا تھا، وہ خود ہی حساس ہو گئی تھی۔ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ اس کی پیٹھ پیچھے عورتیں جو باتیں کرتی تھیں وہ اس تک پہنچ جایا کرتی تھیں۔ یہ چوٹ اس کے لیے ناقابل برداشت تھی کہ اس کی منگنی ٹوٹی اور دو گھروں میں اس کا رشتہ پیش کیا گیا تو کسی نے قبول نہ کیا۔ مجھے یہ افسوس ہوتا تھا کہ آزادی کے جہاد کی ایک مجاہدہ کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا تھا اور وہ جہاد کے دوران زخمی ہوئی تھی۔

مجھے جب والد صاحب کا یہ خط ملا کہ وہ کراچی آ گئے ہیں اور کراچی میں پاکستان کا سیکرٹریٹ بن رہا ہے تو مجھے عجیب سی خوشی ہوئی۔ پروین ملی تو میں نے اسے بتایا کہ کراچی میں پاکستان کی حکومت کے دفاتر بن رہے ہیں اور اس فتح میں تمہارا خون شامل ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ خوشی کا اظہار کس طرح کروں۔ میں تو صرف سکول اور کالج کے امتحانوں میں پاس ہونے کی خوشی سے واقف تھا۔ آزادی کی خوشی میرے لیے انوکھی تھی۔ کبھی تو جی چاہتا کہ اٹھ کر ناچنے لگوں اور یہ بھی دل میں آئی کہ پروین کو سینے سے لگا لوں۔

میں جب زیادہ بیتاب ہو گیا تو پروین کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور میں نے بے اختیار کہا ——— "پروین! ہم آزاد ہو گئے ہیں۔ دو تین دنوں بعد تم سرکاری عمارتوں پر پاکستان کا جھنڈا دیکھو گی۔"

پروین کے آنسو نکل آئے، پھر وہ سسکنے لگی۔ میں نوجوان تھا کسی روتے

کو بہلانے کا طریقہ معلوم نہیں تھا۔ میں اسے دیکھتا اور پریشان ہوتا رہا۔

"تمہیں یاد ہے اصغر؟" ——— اس نے کہا ——— "میں نے ایک روز کہا تھا کہ میں چاہتی ہوں کہ میری شادی آزادی کے بعد ہو اور میرے بچے اپنے آزاد ملک میں پیدا ہوں ..... میری شادی تو ہو گی نہیں۔"

"مجھے اپنے آبا جان سے ملنے دو" ——— میں نے کہا ——— "شاید وہ مان جائیں۔"

"میرا باپ جاہل ہے" ——— اُس نے دانت پیس کر کہا۔ اس سے پہلے اس نے اپنے باپ کی اس طرح کبھی توہین نہیں کی تھی۔ بولی ——— "اُس کے پاس نہ جانا ..... اور سنو اصغر! میرا باپ مان بھی گیا تو میں انکار کر دوں گی۔ میں تمہیں اتنے بڑے امتحان میں نہ ڈالوں گی۔ تم کراچی چلے جاؤ اور مجھے بھول جاؤ۔"

ذرا سوچ کر بولی ——— "۱۴ اگست کے بعد جانا۔ آزادی کے پہلے روز میرے ساتھ رہنا۔"

ایک دو دنوں کی بات تھی۔ میں رک گیا۔

اور آزادی کی صبح طلوع ہوئی۔

پروین بہت سویرے آ گئی۔ بہت خوش تھی۔ عمر خوش تھا۔ عمر کی ماں خوش تھی۔ عمر کا باپ خوش تھا۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ یہ خوشی کس قسم کی تھی تو میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکوں گا۔ پروین کے جذبات مجروح تھے۔ اُسے ذرا سکون دینے کے لیے میں نے اُسے کہا کہ پروین، یہ پاکستان تمہارا ہے، تم نے بنایا ہے۔

وہ اپنی خراب آنکھ کو دوپٹے میں چھپائے رکھتی تھی۔ میری بات سن کر اُس نے دونوں آنکھیں دوپٹے میں چھپا لیں اور کمرے سے نکل گئی۔

اس کے بعد کی ایک ملاقات میں بھی اس نے مجھے کہا کہ وہ مجھے کسی امتحان میں نہیں ڈالے گی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کے دل سے میری محبت کبھی نہیں نکلے گی۔

میں مجبور ہوگیا اور اگلے روز کراچی جانے کے لیے تیار ہوگیا ۔ پروین آخری ملاقات کے لیے آئی اور بہت روئی ، کہنے لگی ——— "تم چلے جاؤ گے تو میں دل کی باتیں کس کے ساتھ کیا کروں گی ۔ سہیلیوں سے تو میں یہ کہا کرتی ہوں کہ مجھے اپنی شادی کا کوئی غم نہیں ۔ میں ان کے ساتھ یہ باتیں نہیں کیا کرتی جو تمہارے ساتھ کرلیتی ہوں ۔"

میں اسے کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا ۔ اُس نے پوچھا کہ کل میں کون سی گاڑی سے جا رہا ہوں ۔ میں نے اُسے بتایا کہ شام کے بعد ایک گاڑی جاتی ہے ۔ اس نے کہا کہ کل دن کو کسی وقت آؤں گی ۔ عمر ہماری ملاقاتوں میں مددگار تھا ۔

پروین آگئی ۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ اکھڑی ہوئی ہے ۔ اس کی طبیعت ٹھکانے نہیں تھی ۔ آتے ہی کہنے لگی کہ تم باہر چلے جاؤ ، میں آجاؤں گی ۔ آج باہر نکلنے کو جی چاہ رہا ہے ۔

میں باہر نکل گیا ۔ وہ مجھ سے کچھ دور پیچھے پیچھے آگئی ۔ ہم تانگوں کے اڈے کے پاس اکٹھے ہوئے ۔

"شاہی مسجد چلو" ——— اس نے کہا ——— "مینار پر چلیں گے وہاں سے مجھے سارا پاکستان نظر آئے گا ۔"

اُس کا لب و لہجہ مجھے کچھ بدلا بدلا سا لگا ۔ میں نے اسے تانگے میں بٹھایا اور ہم شاہی مسجد چلے گئے ۔ اندر گئے اور مینار پر چڑھنے کے دو ٹکٹ لے کر اوپر چلے گئے ۔ اُن دنوں مینار پر کوئی نہیں چڑھتا تھا ۔ کسی کو سیر کی ہوش نہیں تھی ۔ مشرقی پنجاب سے لُٹے پٹے مہاجرین کے قافلے آ رہے تھے ۔ لاہور میں بھی بدامنی تھی ۔ مسلمان یہاں کے ہندوؤں سے مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے مسلمانوں کے خون کا انتقام لے رہے تھے ۔

میں اور پروین مینار پر کھڑے تھے ۔ میں نے پروین کو بٹھا لیا ۔ وہ برقعے میں تھی ۔ اس نے مینار سے ہر طرف دیکھا ۔ لاہور ہمارے پاؤں کے نیچے تھا ۔ میں

پہلی بار مینار پر گیا تھا ۔ پروین نے ٹھیک کہا تھا کہ مینار سے سارا پاکستان نظر آئے گا ۔ افق سے افق تک کی وسعت نظر آ رہی تھی ۔

پروین اُٹھ کھڑی ہوئی اور مینار سے جھکی ۔ اُس نے میری طرف دیکھا ۔ پھر نیچے دیکھا جیسے بلندی کا اندازہ کر رہی ہو ۔ میں نے اس کا ایک ہاتھ پکڑ کر کہا ——— "بیٹھ جاؤ پروین ! اتنا نہ جھکو"

اس نے میری طرف دیکھا ۔ اس کے آنسو بہ نکلے ۔ میں نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا ۔ اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور کہا ۔ "پروین کب تک روتی رہو گی ۔"

اس نے اچانک اپنا سر میرے سینے پر پھینک دیا اور بڑی ہی بلند اور رندھیائی ہوئی آواز میں بولی ——— "اصغر ! مجھے مرنے سے بچا لو ۔ میں آج یہاں سے چھلانگ لگا کر مرنے کے لیے آئی تھی ۔ میں بزدل ہوں ۔ میں دُکھی ہوں اصغر ! مجھے مرنے سے بچا لو ۔"

میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اسے اپنے بازو میں لیا اور سیڑھیاں اترنے لگا ۔ اُوپر زیادہ دیر رُکنا خطرناک تھا ۔ نیچے آکر ہم بارہ دری کے باغ میں بیٹھ گئے ۔

"میں مرتے وقت تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی" ——— اُس نے کہا ——— "میں گھر اپنے تکیے کے نیچے اپنے ماں باپ کے نام رقعہ چھوڑ آئی ہوں ۔ میں نے لکھا ہے کہ میں اتنی دکھی ہوں کہ زندگی کے جہنم سے آزاد ہونے جا رہی ہوں ۔ شاہی مسجد کے مینار سے پاکستان کو دیکھ کر چھلانگ لگا دوں گی اور پاکستان کی مٹی میں مل جاؤں گی ۔"

اُس نے ایک اور انکشاف کیا ۔ وہ یہ کہ اس کی برادری کا ایک لڑکا اسے دل و جان سے چاہتا تھا اور پروین کے دل میں بھی اس کی محبت تھی ۔ ماں باپ نے پروین کی منگنی کہیں اور کر دی ۔ وہ پھر بھی اس لڑکے سے ملتی رہی ۔ آنکھ نکل جانے کے بعد جب پروین کو ہر طرف سے جواب مل گیا تو وہ اس لڑکے سے ملی ۔

یہ اس کی برادری کا لڑکا تھا۔ شادی ہو سکتی تھی مگر لڑکے نے بھی اسے دھوکہ دیا اور اس سے میل ملاقات ترک کر دی۔ یہ آخری چوٹ تھی جس نے اس کا دل توڑ دیا اور وہ خودکشی کرنے کا فیصلہ کر بیٹھی۔ وہ شاید اپنا دل مضبوط رکھنے کے لیے مجھے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

میں نے اُسے کچھ بھی سوچنے کی مہلت نہ دی۔ اسے اٹھایا۔ باہر جا کر تانگے میں بیٹھے اور میں اُسے ریلوے سٹیشن لے گیا۔ اُن دنوں لاہور ریلوے سٹیشن آج والا سٹیشن نہیں تھا۔ پلیٹ فارموں پر پناہ گزینوں کا اتنا ہجوم کہ چلنے کا راستہ نہیں ملتا تھا۔ گاڑیوں کے آنے جانے کا کوئی وقت نہیں تھا۔

میں نے پروین کو اس ہجوم میں ایک جگہ بٹھا دیا اور اُسے کہا کہ میرے آنے تک وہ یہیں رہے۔ میں باہر نکلا اور تانگہ لے کر عمر کے گھر گیا۔ اسے کچھ بھی نہ بتایا۔ اپنا اٹیچی کیس اور بستر اٹھایا۔ عمر میرے ساتھ تانگے تک آیا۔ وہ سٹیشن تک ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے کچھ جھوٹ بول کر اُسے اپنے ساتھ نہ چلنے دیا۔

پروین وہیں بیٹھی تھی جہاں میں اُسے بٹھا آیا تھا۔ تب اُسے بتایا کہ میں اُسے کراچی لے جا رہا ہوں۔ وہ ذرا گھبرائی لیکن میرے دل میں کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔ میں نے تھرڈ کلاس کے دو ٹکٹ لیے۔ شام کے وقت ایک گاڑی کراچی کے لیے تیار ہوئی۔ ہم دونوں ہجوم میں سوار ہو گئے۔ بڑا ہی تکلیف دہ سفر تھا۔

میں جب کراچی اپنے خاندان میں پہنچا تو ایک جوان لڑکی کو میرے ساتھ دیکھ کر سب چُپ سے ہو گئے۔ میں نے والد صاحب کو الگ کر کے پروین کی ساری کہانی سنائی اور انہیں کہا کہ میں پروین کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں والد صاحب تو مان گئے، والدہ کو مناتے دشواری پیش آئی۔ جس لڑکی کے ساتھ دلّی میں میری منگنی ہوئی تھی وہ بھی کراچی آگئی تھی۔ والدہ لڑکی والوں کے سامنے شرمسار ہونے سے ڈرتی تھی۔ انہوں نے پروین کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے

کہا کہ میں نے پاکستان پر دلّی قربان کر دی ہے تو اپنا یہ گھر بھی قربان کر سکتا ہوں۔ میں گھر میں نہیں رہوں گا ——— والدہ مان گئیں۔

میری اور پروین کی شادی ہو گئی۔ میں نے دو مہینوں بعد اُس وقت اللہ کا شکر ادا کیا جس روز میری والدہ نے مجھے کہا ——— "اگر دو آنکھوں والی بہو ہوتی تو شاید اتنی اچھی نہ ہوتی۔"

میں نے شادی کے فوراً بعد پروین کے والد صاحب کو خط لکھ دیا تھا۔ میرا یہ خط بڑا سخت تھا۔ میں نے اس آدمی کو بہت شرمسار کیا تھا۔ اسے لکھ دیا تھا کہ آپ کو پروین کا رقعہ مل چکا ہو گا اور آپ شاہی مسجد اس کی لاش لینے گئے ہوں گے لیکن میں نے اسے مرنے نہیں دیا۔ البتہ آپ کے لیے وہ مر گئی ہے۔

اُس کے باپ کا آج تک جواب نہیں آیا۔

مجرم یا مجاہد؟

لڑکیاں وہی قسمت والی تھیں، جو پاکستان حاصل کرنے کے جہاد میں شامل ہوئی تھیں آج وہ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء کے وقت کے اپنے کارنامے فخر سے اپنے بچوں کو سناتی ہوں گی۔ لوگ ان کی کہانیاں پڑھ کر انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوں گے مگر میں جب ان بہنوں کے یہ کارنامے پڑھتی ہوں تو میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ میں "بھٹکی ہوئی منزل،، والی زاہدہ بہن سے زیادہ جرأت والی نہ ہوئی تو ان کے برابر کی جرأت ضرور رکھتی تھی لیکن قسمت اور حالات کا تماشا دیکھیں کہ میری ان مجاہدہ بہنوں کی جرأت کہاں استعمال ہوئی اور میں نے جرأت کہاں استعمال کی۔ کبھی میرا ضمیر مجھے شرمسار کرتا ہے، کبھی میں ضمیر کو شرمسار کرتی ہوں۔

میری کہانی پڑھ کر آپ مجھے گنہگار کہیں گے۔ میرے بعض بزرگ اور نظامِ مصطفےٰ کے نعرے لگانے والے لوگ کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہیں گے ——— "ایک عورت کی یہ جرأت ؟ یہ بے حیائی ؟ ایسی عورت کو سنگسار کر دینا چاہیے۔ نظامِ مصطفےٰ میں ایسی عورت کا وجود برداشت نہیں کیا جائے گا"

مجھ پر جو بیتی ہے وہ میں ضرور سناؤں گی۔ آپ کے دماغ میں جو فتویٰ آئے مجھ پر تھوپ دیں۔ اُنہی دنوں کا ذکر ہے جب میرے ساتھ کی لڑکیاں چار دیواری کے قید خانے توڑ کر آزادی کے جہاد میں شامل ہوئی تھیں۔ میری شادی کی تیاریاں

ہو رہی تھیں - جب لڑکیوں پر آنسو گیس پھینکی جا رہی تھی، انہیں سڑکوں پر پولیس گھسیٹ رہی تھی اور لڑکیاں برقعوں سے نکل کر پولیس کی لاٹھیوں اور گولیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سرکاری عمارتوں پر جھنڈے لہراتی اور اپنے بھائیوں کو جانیں قربان کرنے کے لیے مشتعل کیے رکھتی تھیں، میرے گھر میں برادری کی ان پڑھ عورتیں ڈھولکی پر بے سُرے گانے گایا کرتی تھیں -

مجھے رتی برابر خوشی نہیں تھی - کبھی تو اکیلے میں میرے آنسو نکل آتے تھے - مجھے اُن لوگوں سے نفرت تھی جن کی میں بہو بن کے جا رہی تھی اور مجھے اُس آدمی سے نفرت تھی جس کی میں بیوی بننے والی تھی - ان سے زیادہ نفرت کے حق دار میرے ماں باپ تھے - ان سب نے مل کر میری تعلیم ختم کی - مجھے باہر نہ جانے دیا کہ میں بھی آج اپنے بچوں کو فخر سے سناتی کہ میں پاکستان کی جنگِ آزادی کی مجاہدہ ہوں -

میرے سُسرال والے جنگِ عظیم سے بہت مدت پہلے سے رنگون (برما) میں کوئی کاروبار کرتے تھے - میں نے سُنا تھا کہ رنگون برما کا بہت بڑا شہر تھا اور وہاں تاجر، بیوپاری اور دکاندار زیادہ تر ہندوستان کے لوگ تھے اور ان میں پنجابی بھی بہت تھے - انہی میں میرا سُسر بھی تھا - وہ اپنے کنبے کو ساتھ رکھتا تھا - ڈیڑھ سال میں ایک دو مہینوں کے لیے اپنے بیوی بچوں کو گھر بھیج دیا کرتا تھا - جب جنگِ عظیم شروع ہوئی تو یہ کنبہ پنجاب میں اپنے گھر میں تھا - میرا سُسر اور اس کے دو بیٹے اس کے ساتھ رنگون میں تھے - یہ لوگ امیر تو نہیں تھے، آسودہ حال اور خوشحال تھے -

۱۹۴۱ء میں اس گھر میں اچانک ماتم شروع ہو گیا - جاپان کی فوج نے برما پر حملہ کر دیا تھا - شاید اخباروں سے معلوم ہوا تھا کہ رنگون سے ہندوستانی باشندے، تاجر وغیرہ بھاگ آئے ہیں اور ان میں سے بہت سے مارے گئے ہیں - معلوم نہیں یہ کہاں تک سچ تھا کہ جاپانیوں اور برمیوں نے ہندوستانیوں کی دکانوں اور گھروں کو لُوٹ لیا ہے اور ہزاروں کنبے وہاں سے پیدل ہندوستان کو چل

پڑے ہیں - اگر آپ جغرافیہ پڑھے ہیں تو آپ کو سمجھ آ سکتی ہے کہ رنگون سے پیدل آتے ہوئے یہ لوگ برما کے جنگلوں اور پہاڑیوں میں سے کس طرح گذرے ہوں گے اور ایسے دشوار گذار علاقے میں کتنے ہندوستان پہنچے اور کتنے مرے ہوں گے -

اُس وقت میری عمر بارہ تیرہ سال تھی - مجھے یاد ہے کہ دو سال کے عرصے میں یہ گھرانہ بھیک مانگنے پر آ گیا تھا، میرے سُسر اور اس کے بیٹوں کی کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی کہ زندہ ہیں یا برما کے جنگلوں میں مارے گئے ہیں - دو سال بعد اس گھر میں خوشیاں منائی جانے لگیں - انہیں میرے سُسر کا خط ملا کہ وہ کلکتہ پہنچ گئے ہیں اور وہیں کاروبار کی صورت نکل آئی ہے -

اُس وقت میرے فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ میں اس گھر میں دُلہن بن کر جاؤں گی - ان لوگوں کے متعلق میں اتنا ہی جانتی تھی کہ ہماری ذات اور برادری کے لوگ ہیں - ان کا محلہ ہمارے محلے سے تھوڑا ہی دُور تھا -

خط کے ساتھ کچھ رقم بھی آ گئی تھی جس سے اس گھر میں طریقے سلیقے کی ہانڈی ایک بار پھر پکنے لگی - ان کے دن پھر گئے - کوئی ایک سال گزرا ہو گا کہ میرا سُسر اور اس کے بیٹے آ گئے - یہاں انہوں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا لیکن ان کی مالی حیثیت کچھ زیادہ بہتر نہ ہو سکی - محلے برادری میں ان کا شمار نہایت معمولی گھرانوں میں ہوتا تھا جن کے متعلق بعض اوقات یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ محلے میں موجود بھی ہیں یا نہیں

پھر اچانک ہی یوں ہوا کہ ان کے گھر پیسوں کی بارش ہونے لگی - انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر دکانداری کے علاوہ ٹھیکیداری بھی شروع کر دی تھی - مجھے بالکل معلوم نہیں کہ یہ ٹھیکیداری اور یہ کاروبار کیا تھا - کم از کم میرا اس گھرانے کی کسی لڑکی یا عورت کے ساتھ میل جول نہیں تھا -

بہت تھوڑی مدت میں یہی گھرانہ جس نے پہلے خوشحالی پھر بڑی سخت غربت دیکھی تھی اور جس کی موجودگی کا کبھی احساس نہیں ہوتا تھا، برادری کا اہم گھرانہ بن گیا - اس گھر کے سامنے دیگیں پکنے لگیں - کبھی پتہ چلتا کہ آج تین

دیگیں پک کر داتا دربار جا رہی ہیں، کبھی غریبوں کے لیے دیگیں پکتی تھیں لیکن
زردہ پلاؤ محلے اور برادری کے گھروں میں بھیجا جاتا تھا۔ کبھی میلاد کی محفل کا اعلان
ہوتا۔ ساری برادری کو مدعو کیا جاتا اور گلی میں دیگوں کی قطار پک رہی ہوتی۔

میرے سسر نے خیرات کا ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا کہ ہماری ایک ہی
آبادی میں جو چار مسجدیں تھیں ان میں سے کسی نہ کسی کو چندہ دیتا اور جمعہ کے خطبے
کے دوران اس کا باقاعدہ اعلان کراتا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے برادری کے
غریب گھرانوں پر نوازشیں شروع کر دیں۔ مگر ان دیگوں، میلاد کی تقریبوں،
مسجدوں کی اور برادری کے دو چار گھروں کی مالی امداد سے مراد صرف نمائش
تھی اور یہ سب اپنی امیری کی پبلسٹی کے ڈھنگ تھے۔ یہ لوگ کسی غریب گھر کو
سو پچاس روپے دے دیتے تو ہر کسی کو سناتے پھرتے۔

پاکستان میں جس طرح دولت انسان کو لیڈر اور دانشمند بنا دیتی ہے اور
جس طرح دولت ہر عیب پر پردہ ڈال دیتی ہے اسی طرح اس وقت بھی ہوتا
تھا جب ہم آزاد نہیں ہوئے تھے۔ میرا ہونے والا سسر بھی روپے پیسے کی
بدولت برادری کا لیڈر بن گیا۔ برادری اس سے صلاح مشورے لینے لگی۔

اس کا ایک بیٹا جوان تھا۔ اسے بیٹیوں والے رشتوں کے پیغام بھیجنے
لگے، مگر میری قسمت پھوٹ کہ لڑکے کی ماں اور بہنوں نے مجھے پسند کیا۔ اگر میری
ماں نے انہیں میرے لیے درپردہ پیغام بھیجا تھا تو یہ میرے علم میں نہیں۔ مجھے یہی
معلوم ہے کہ ادھر سے اشارہ ملا ادھر میرے ماں باپ نے ہاں کر دی اور شادی
کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ میری شادی تو کہیں نہ کہیں ہونی ہی تھی۔
میری اپنی کوئی پسند نہیں تھی۔ میں پردہ دار لڑکی تھی۔ میں قوم کی انہی بیٹیوں
میں سے تھی جنہیں جس کے ساتھ ڈولی میں بٹھا کر روانہ کر دیں وہ اسی کی باندی
بن جاتی ہیں۔ وہ چاہے کالا ہو، بھدا ہو، بیٹی ماتھے پر شکن نہیں پڑنے دیتی۔
میری بھی شادی اسی طرح ہونی تھی اور میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار بھی

تھی مگر میں بی۔ اے کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ ابھی تو میں سیکنڈ ائیر میں تھی۔ دو
ایک ہفتوں تک امتحان ہونے والے تھے۔ بی۔ اے کے بعد شادی کا ارادہ
تھا۔ وہ لوگ منگنی کے لیے آ گئے۔ یہ رسم غیر ضروری تھی لیکن رشوت کے ذریعے
جو ٹھیکے لیے جاتے تھے ان سے حاصل کی ہوئی دولت کو کہیں پھینکنا ضروری
تھا۔ وہ تیس اور چالیس کے درمیان افراد کی بارات سی لے کے منگنی کے لیے
آئے۔ ساتھ کپڑے، لڈوؤں کا ٹوکرہ، انگوٹھی اور نہ جانے کیا کیا اٹھا لائے۔

میرے ماں باپ اتنے خرچ پر پوری شادی کر ڈالتے مگر منگنی کی تقریب
ہمیں اس لیے برداشت کرنی پڑی کہ یہ لڑکے والوں کی خواہش تھی۔ لڑکی والے
تو بے چارے غلام ہوتے ہیں، لڑکے والوں کا ہر حکم مانتے اور خدا کا شکر ادا
کرتے ہیں کہ لڑکی کے بوجھ سے آزاد ہوئے۔

لڑکے والوں کی یہ فرمائش بھی پوری کرنی پڑی کہ منگنی کی "بارات" کو ہم
ایک وقت کا کھانا کھلائیں۔ میں تین روز کالج نہ جا سکی۔ تیاریوں کے لیے گھر
میں میری ضرورت تھی۔ مجھے ماں باپ کا پیسہ ایک غیر ضروری رسم پر ضائع ہونے
کا اتنا افسوس نہیں تھا جتنا کالج نہ جانے کا۔ منگنی ہوئی۔ میرے حصے
میں ایک انگوٹھی اور کپڑوں کے دو جوڑے آئے، جو ہمیں بہت ہی مہنگے پڑے۔
لڈوؤں کا ٹوکرہ محلے اور برادری والے کھا گئے اور کئی گھروں کے گلے شکوے
آئے کہ ہم نے انہیں لڈو نہیں بھیجے۔ انہیں بازار سے خرید کر لڈو بھیجے گئے مگر
گلے شکوے قائم رہے کیونکہ ——— "یہ لڈو بازار کے ہیں منگنی کے تو نہیں"۔
مہمان چلے گئے تو ہماری حالت ایسی تھی جیسے بگولا آیا اور سب کچھ اڑا کر لے
گیا ہو۔ والد صاحب کے چہرے پر پیلاہٹ صاف نظر آ رہی تھی۔ میرا کوئی
بڑا بھائی نہیں تھا۔ میں نے والد صاحب سے کہا کہ انہیں اتنا بوجھ اپنے سر
لینا ہی نہیں چاہیئے تھا صاف کہہ دیتے کہ ایسی رسم کی ضرورت نہیں ہم منگنی
کے بغیر شادی کر دیں گے۔ والد صاحب نے مجھے ایسا جواب دیا کہ [illegible]

منہ کی طرف دیکھتی رہ گئی ۔

"تمہارا دماغ چل گیا ہے"؟ انہوں نے تعجب کے لہجے میں کہا "برادری میں ہمیں ذلیل کرانے کا ارادہ تھا ؟ ہم تو خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اتنا اچھا اور اتنا امیر گھرانہ اور اتنی زیادہ آمدنی والا لڑکا مل گیا ہے ۔ لوگ مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں کہ یہ شخص کتنا خوش قسمت ہے"۔

"اگر منگنی کے لیے اتنے لوگ آئے تھے تو شادی پر تو ایک ہزار کی بارات ہوگی"۔ میں نے کہا ۔

"چاہے دو ہزار ہو" ۔ والد صاحب نے بڑی دلیری سے کہا "انسان اپنی عزت کے لیے کماتا ہے ۔ ضرورت پڑی تو اِدھر اُدھر سے کچھ رقم پکڑ لُوں گا۔ دو تین ساہوکار (ہندو) اپنے دوست ہیں ۔ ہم ادا کرتے رہیں گے"۔

ایسی ہی باتیں میری ماں نے کیں جن سے میرے والد صاحب کا حوصلہ بڑھ گیا ۔ ماں بھی خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اتنا اُونچا گھرانہ مل گیا ہے ۔ یہ ہمارے معاشرے کا دستور ہے کہ ماں باپ اپنی بیٹیوں کے لیے ایسا گھرانہ تلاش کرتے ہیں جو خوشحال ہو اور جس کا بڑا نام ہو ۔ ظاہری طور پر یہ بیٹی کی سُکھی زندگی کے لیے کیا جاتا ہے ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بڑوں سے رشتہ داری جوڑ کر ماں باپ اپنی شان بڑھانا چاہتے ہیں ۔ یہ تو دیکھ لیتے ہیں کہ لڑکے کی آمدنی زیادہ ہے بلکہ آج کل "بالائی آمدنی" کا اظہار بھی بلا جھجک کیا جاتا ہے مگر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ لڑکے میں اپنی عقل استعمال کرنے کی صلاحیت ہے یا نہیں اور اس میں خاوند بننے کے کتنے کچھ اوصاف ہیں ۔ لڑکی کے ماں باپ اتنی چھان بین کرنے کی بجائے اسی سے خوش ہو جاتے ہیں کہ ان کی بیٹی کا رشتہ طے ہو گیا ہے ۔ لڑکے کی بجائے لڑکے والوں کو دیکھنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ ہمارے ملک میں شادی لڑکی لڑکے کی نہیں دو خاندانوں کی شادی ہوتی ہے ۔

مجھے یہ دیکھ کر بہت رنج ہوا کہ میرے تعلیم یافتہ اور اچھے عہدے والے

والد صاحب بھی زمانے کے دستور کے پابند تھے ، اور وہ اپنی جھوٹی عزت اور شان کے لیے ساہوکار سے قرض لینے کو بھی تیار تھے ۔ مجھے ایک اور غم کھانے لگا تھا ۔ منگنی سے پہلے میری ہونے والی ساس اور اس کی بہنیں ہمارے گھر دو تین بار آئی تھیں ۔ ان کے گھر تعلیم حاصل کرنے کا دستور نہیں تھا ۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ میں تعلیم ترک کر دُوں ۔ ساس کے الفاظ آج بھی مجھے یاد ہیں ———— "کیا فائدہ مغز کھپانے کا ۔ مجھے دیکھو ۔ الف سے ب نہیں پڑھی ، لیکن ساری برادری جھک کر سلام کرتی ہے"———— اور اس نے اپنی امیری کی بڑی لمبی تفصیل سنا ڈالی ۔ پھر انہوں نے باری باری اپنے لڑکے کی ایسی ایسی تعریفیں کیں کہ اُسے سیف الملوک بنا دیا جس پر پریاں عاشق ہو گئی تھیں ۔ مَیں نے اس لڑکے کو بچپن میں شاید کبھی دیکھا تھا ۔ اتنا سُنا تھا کہ لڑکا واقعی خوب صورت ہے ۔

مَیں نے کہا کہ مَیں بی ۔ اے تو ضرور کروں گی مگر ساس اور اس کی بیٹیوں نے جو باتیں کیں ان سے مجھے یہی خطرہ دکھائی دینے لگا کہ یہ بدبخت مجھے ایف ۔ اے بھی نہیں کرنے دیں گی ۔ منگنی والے دن ساس نے سنجیدگی سے کہا کہ میں کالج جانا چھوڑ دوں ۔ میں نے اُسے اس سے زیادہ سنجیدگی سے جواب دیا کہ اگر آپ کا ہی حکم چلے گا تو اس سے پہلے ایف ۔ اے ضرور کرونگی۔ ساس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ اُس نے بُرا منایا ہے ۔

منگنی کر کے سب چلے گئے تو ماں نے مجھے بہت ڈانٹا کہ میں اپنی اتنی اچھی قسمت میں بٹے ڈال رہی ہوں ۔ مجھے ایسا جواب نہیں دینا چاہیئے تھا ۔ میں یہ جواب دیتی کہ اچھا خالہ جی ! جیسے آپ حکم دیں گی میں ویسے ہی کرونگی ۔

میرے عزم اور میرے جذبے وہیں ختم ہو گئے اور دل کو جیسے کسی نے چڑیا کے بچے کی طرح مُٹھی میں جکڑ لیا ہو ۔ منگنی کے بعد ایک اور رَو چل پڑی ۔ یہ عجیب و غریب باتوں کی رَو تھی ۔ یہ ان تین گھرانوں کی طرف سے چلی تھی جن

کی بیٹیوں کو میرے ہونے والے سُسرال نے قبول نہیں کیا تھا۔ اس میں ہمارا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ چار دیواری کی دنیا میں عورتیں اِدھر کی اُدھر اور اُدھر کی اِدھر کس طرح پہنچاتی ہیں۔ باتیں پھیلانے کے لیے کسی اخبار، رسالے، ریڈیو اور لاؤڈ سپیکر کی ضرورت نہیں۔ کسی عورت کے کان میں بات ڈال دو، وہ بات سارے شہر میں پھیل جائے گی۔ اگر کوئی بات جلدی پھیلانی ہو یا اپنے دُشمنوں تک پہنچانی ہو تو جس عورت کے کان میں بات ڈالو اُسے یہ بھی کہو ——— "دیکھو بہن! میں نے تم پر اعتبار کیا ہے۔ یہ بات کسی اور کو نہ بتانا" ——— یہ بات تار کی طرح گھر گھر پہنچ جائے گی۔

میری منگنی کے بعد پروپیگنڈے کا یہ سلسلہ چل پڑا۔ کبھی کوئی عورت میری ماں کے کان میں یہ بات ڈال جاتی کہ میرے ہونے والے سُسرال مجھ پر شُبہ کر رہے ہیں کہ مَیں چونکہ کالج میں پڑھتی ہوں اس لیے میں غلط قسم کی آزاد خیال لڑکی ہوں۔ کوئی اور عورت میرے سُسرال کے خلاف باتیں کر جاتی۔ ایک عورت نے بتایا کہ لڑکے کو مرگی یا ہسٹریا کی طرح کا دورہ پڑتا ہے۔

میری ماں نے مجھے کہا کہ میں اِن عورتوں کی باتیں نہ سنوں، یہ سب ان گھروں سے اُٹھ رہی ہیں جن کی بیٹیوں کے رشتے میرے ہونے والے سُسرال نے قبول نہیں کیے۔ ان بیٹیوں کی مائیں خفت مٹا رہی تھیں اور ان کی کوشش یہ بھی تھی کہ میرے اور میرے منگیتر کے والدین کے درمیان ایسی غلط فہمی پیدا ہو کہ منگنی ٹوٹ جائے۔

مَیں خود بھی منگنی ٹوٹ جانے کی خواہشمند تھی، اِسی لیے میں محلے برادری کی عورتوں کی لگائی بجھائی کا ذکر اپنی ماں کے ساتھ اس طرح کرتی تھی جیسے یہ ساری باتیں سچ ہوں۔ میری ماں ہر وقت میرے ہونے والے سُسرال کی تعریفوں کے پُل باندھتی رہتی تھی۔ مَیں نے ماں سے بہت دفعہ کہا کہ میرے منگیتر کے متعلق ... جو معلوم ہوا ہے کہ اسے کوئی دورہ پڑتا ہے اسکی چھان بین

کر لینی چاہیئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انہوں نے اپنے بیٹے کا مرض چُھپا رکھا ہو۔ میری ماں میری یہ بات سُنتے ہی بھڑک اٹھتی تھی جیسے مَیں نے سُسرال والوں کی توہین کر ڈالی ہو۔

مَیں نے ایک بار اپنے والد صاحب سے بھی اس خدشے کا ذکر کیا مگر وہ مجھ پر برس پڑے۔ مختصر یہ کہ میرے ماں باپ نے صرف یہ دیکھا کہ ان کی رشتہ داری ایک مالدار گھر سے ہو گئی ہے اور "بیٹی سکھی رہے گی"۔

میرے سُسرال نے اپنے خلاف میرے دل میں بہت جلدی نفرت پیدا کر لی۔ وہ اس طرح کہ میرے منگیتر کی ماں ہمارے ہاں آتی تو مجھے تعلیم ترک کرنے کا ضرور کہتی۔ اس کے لہجے میں اب حکم ہوتا تھا۔ اس کا یہ حکم تو اب تیر کی طرح میرے دل میں اُتر جاتا تھا۔ اُس کی شکل وصورت بُری نہیں تھی لیکن بڑھاپے کی لکیریں چہرے پر گہری ہو گئی تھیں۔ اس عمر میں وہ نوجوان لڑکیوں کی طرح بلکہ دیہاتی لڑکیوں کی طرح زیور پہنتی تھی۔ یہ دولت کی نمائش تھی۔ دولت کی نمائش اس کی ہر بات میں ہوتی تھی۔ وہ ایسی ایک دو باتیں بھی کہ جاتی تھی جیسے اپنے مقابلے میں ہمیں غریب سمجھ رہی ہو۔ اس کی بیٹیاں بھی آتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے اس لیے ذرا سی خوشی ہوتی تھی کہ میری ہم عمر ہیں مگر وہ ماں سے بڑھ کر شو باز تھیں۔ غیر قدرتی سے لہجے میں باتیں کرتی تھیں جسے بناوٹ کہتے ہیں۔

یہ تو ایک قسم کی مایوسی اور اذیّت تھی جس سے میرا سکون تباہ ہو گیا۔ ایک مایوسی اور قسم کی بھی تھی جو زیادہ اذیّت ناک تھی۔ میں نے ایف۔ اے تو کر لیا مگر تھرڈ ایئر میں داخلہ نہ لینے دیا گیا۔ مَیں ماں سے داخلے کے لیے کہتی تو ماں میرے سُسرال کا حوالہ دے کر کہتی کہ وہ پسند نہیں کرتے۔

کسی طرح یہ خبر اُدھر بھی پہنچ گئی کہ میں تھرڈ ایئر میں داخلہ لینا چاہتی ہوں۔ میری ساس اپنا حکم لے کر آئی اور اس کی بیٹیاں اپنے "بھائی جان" کا حکم لے کر آئیں کہ میں داخل نہیں ہو سکتی۔ ساس نے یہاں تک کہہ دیا ———

”ہمارا گھر زکوٰۃ اور خیرات دینے والا ہے۔ میلاد کے ہم پابند ہیں۔ ہمارے گھر میں یہ بے حیائی پسند نہیں کی جاتی کہ لڑکی کالج جائے“۔

مَیں یہ بھی برداشت کر لیتی لیکن جو اذیت مجھ سے برداشت نہ ہو سکی وہ یہ تھی کہ مجھے تحریکِ پاکستان سے الگ کر دیا گیا تھا۔ میری ایف۔اے تک کی ہم جماعت لڑکیاں میرے گھر آتی تھیں۔ میری ماں سے کہتی تھیں کہ مجھے اگر کالج میں داخل نہ کیا جائے تو جب کبھی سٹوڈنٹ فیڈریشن کا اجلاس ہو اس میں مجھے شامل ہونے سے نہ روکا جائے، مگر مجھے روک دیا گیا۔

میری ماں کے دماغ پر میرے سُسرال والے بھوت کی طرح سوار تھے۔ میرے بھائی چھوٹے تھے۔ والد صاحب کی ذہنیت میری ماں سے بہتر نہیں تھی۔ وہ دن رات میری شادی کی تیاریوں میں مصروف رہتے تھے۔ شادی کا دن مقرر کرنے کی ابھی کوئی بات نہیں ہو رہی تھی۔ میری ہم جماعت سہیلیاں کبھی کبھی میرے پاس آتی تھیں۔ وہ مجھے تحریکِ پاکستان کی خبریں اور طالبات کی سرگرمیاں سُنا کر مجھے انگاروں پر پھینک جاتی تھیں۔

میرے سُسرال کو شاید شادی کی جلدی نہیں تھی۔ میرے ماں باپ کو یہی فکر لگا رہتا تھا کہ شادی جلدی ہو۔ میں کبھی کبھی حیران بھی ہوتی تھی کہ وہ لوگ اتنی دیر کیوں کر رہے ہیں۔ ایک روز میرے محلے کی ایک سہیلی نے مجھے مصدقہ خبر سنائی کہ میرے منگیتر کو مرگی کی قسم کا کوئی دورہ پڑتا ہے اور ماں باپ اس کا علاج کرا رہے ہیں اور وہ اُسے عاملوں اور پیروں فقیروں کے پاس بھی لے جاتے ہیں۔

میری اس سہیلی کی ایک رشتہ دار لڑکی میرے سُسرال کے محلے میں رہتی تھی۔ وہ میرے منگیتر کی ایک بہن کی گہری سہیلی تھی۔ وہ میرے سُسرال گھر میں بیٹھی تھی کہ اُس کے سامنے میرے منگیتر کو دورہ پڑا۔ اس لڑکی کو بڑی ہوشیاری سے اِدھر اُدھر کر دیا گیا لیکن وہ جو کچھ دیکھ چکی تھی وہ اس کی آنکھوں اور اس

کے ذہن سے نہیں اتارا جا سکتا تھا۔ چار دیواری کی دنیا کی دیواروں کے چار چار کان ہوتے ہیں۔ راز فاش ہو گیا اور مجھ تک پہنچ گیا مگر میں نے اپنی ماں کے ساتھ بات کی تو وہ میری سہیلی کو اور خبر لانے والی لڑکی کو گالیاں دینے لگی۔ کہنے لگی کہ یہ لوگ حاسد ہیں، ہماری قسمت دیکھ کر جلتے ہیں پھر اس نے اس پروپیگنڈے کا ذمہ داران عورتوں کو ٹھہرایا جن کی بیٹیوں کے رشتے میرے سُسرال نے قبول نہیں کئے تھے۔

میں اس اطلاع کو جھوٹ نہیں سمجھی تھی مگر میری وقعت اُن لڑکیوں جتنی تھی جنہیں کبھی سرِعام نیلام کیا جاتا تھا۔ میرے دل میں خوف جم گیا۔ یہ خوف ایسا تھا کہ مجھے یاد ہی نہ رہا کہ مجھ جیسی طالبات تحریکِ پاکستان جسے آپ جنگِ آزادی کہا کرتے ہیں، کے میدان میں اُتر گئی ہیں۔ یہ تو آپ کو بتا چکی ہوں کہ میرے سُسرال کیسے تھے۔ اس کے ساتھ یہ بم پھٹا کہ میرا ہونے والا شوہر کسی خوفناک مرض کا مریض ہے۔ میں مجبور اور بے بس تھی۔ اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے میں نے فیصلہ کر لیا کہ شادی کے بعد دیکھا کہ میرا خاوند واقعی کسی خطرناک دَورے کا مریض ہے تو میں خودکشی کر لوں گی۔

پھر وہ دن آئے کہ محلّے میں سنسنی خیز خبریں آنے لگیں ——— ”آج مسلمانوں نے جلوس نکالا ہے ..... پولیس نے گولی چلائی ہے سینکڑوں مسلمان شہید ہو گئے ہیں ..... آج لڑکیوں کا جلوس نکلا ..... پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔

دو سو لڑکیاں ماری گئیں اور ڈیڑھ سو کو گرفتار کر لیا گیا ہے“۔

مسلمان مظاہرے تو کرتے ہی تھے۔ پولیس تشدد بھی کرتی تھی لیکن جس جگہ پولیس اور جلوس کا تصادم ہوتا تھا وہاں سے ہمارے محلے تک خبر آتے آتے اس قسم کی صورت اختیار کر لیتی تھی کہ ایک زخمی ہوتا تو لوگ کہتے تھے ایک سو آدمی مارے گئے ہیں۔ بہرحال قوم میدان میں نکل آئی تھی۔ آپ اس معرکے کی تفصیل پڑھتے رہتے ہیں۔ کبھی تو میں یہ خبریں سُن کر پنجرے میں بند پرندے کی طرح تڑپنے

لگتی اور کبھی ایسے جیسے میرا ان مظاہروں اور جلوسوں کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ دو بار میری پرانی ہم جماعت لڑکیاں میرے پاس آئیں۔ وہ جلوسوں میں شریک ہوتی تھیں۔ مجھے بھڑکاتی تھیں اور میرے آنسو نکل آتے تھے۔ ان سے صحیح صورتِ حال کا پتہ چلتا تھا۔

قوم کے جذبے کا جو عالم تھا وہ میں صرف ایک مثال سے سنا دیتی ہوں۔ ایک روز میں اپنے کوٹھے پر تھی۔ پچھواڑے کی گلی میں مجھے شور اور دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے فصیل سے جھانک کر نیچے دیکھا۔ چھ سات آدمی لاٹھیاں اٹھائے دوڑے جا رہے تھے۔ سامنے والے مکان کی فصیل سے دو تین لڑکیاں میری طرح نیچے دیکھ رہی تھیں۔ ان سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ پولیس نے عورتوں کے جلوس پر لاٹھیاں اور گولیاں چلائی ہیں اور مال روڈ پر خون ہی خون اور لاشیں ہی لاشیں ہیں۔ یہ خبر سن کر یہ آدمی جوش میں آ کر لڑنے جا رہے ہیں۔ ان آدمیوں کے پیچھے دو عورتیں ہاتھ ملتی تیز تیز جا رہی تھیں اور بلند آواز سے کہہ رہی تھیں ——

"زندہ واپس نہ آنا ...... ہائے! کافروں کا یہ ظلم ...... اپنے سر کٹوا دینا۔"

اگلے روز پتہ چلا کہ عورتوں کا جلوس تو نکلا تھا، آنسو گیس بھی پھینکی گئی تھی، لاٹھی چارج بھی ہوا تھا لیکن "خون ہی خون اور لاشیں ہی لاشیں"، مبالغہ آمیز خبر تھی مگر میرے گھر میں کوئی انقلاب نہیں آیا تھا۔ میں کوٹھے پر کھڑی تھی۔ میرا خون جوش میں آ گیا تھا۔ دل میں یہی آتا تھا کہ کوٹھے سے چھلانگ لگا کر مال روڈ پر چلی جاؤں اور میری لاش گھر آئے۔

اس جذباتی کیفیت میں مجھے اپنی ماں کی چیخ نما آواز سنائی دی۔ وہ مجھے نیچے بلا رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ نیچے گئی تو ماں نے دانت پیس کر کہا ——

"مت کھڑی رہا کر کوٹھے پر۔ انہوں (سسرال) نے دیکھ لیا تو قسمت پہ پانی پھر

[illegible]

یاد دلا دیا کہ میری شادی کا دن مقرر ہو چکا ہے۔

اور یہ دن اُن دنوں میں سے ایک تھا جن کا ذکر زاہدہ بہن کی کہانی "بھٹکی ہوئی منزل" میں بھائی عبدالجبار نے کیا ہے۔ کالجوں کے مسلمان طلباء نے کالجوں میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ عورتیں جن میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی چار دیواری کی دنیا کی دیواریں پھلانگ کر سڑکوں پر نکل آئی تھیں۔ شہروں کی فضا آنسو گیس سے بوجھل رہتی تھی —— "اللہ اکبر۔ لے کے رہیں گے پاکستان۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان۔" کے نعروں اور رائفلوں اور گیس کے گولوں کے دھماکوں سے شہر کا ماحول لرزتا رہتا تھا۔ ماؤں کے نوجوان بیٹے زخمی اور قیدی ہو رہے تھے۔ لڑکیاں اپنے بھائیوں کے دوش بدوش انگریزوں اور ہندوؤں کے متحدہ محاذ کو توڑ رہی تھیں اور گیس سے بے ہوش ہو ہو کر گر رہی تھیں۔ انگریزوں کی عدالتوں اور دفتروں پر سبز جھنڈے چڑھا رہی تھیں۔ اُن دنوں مجھے کوٹھے پر جانے کی اجازت نہیں تھی اور میری شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

ہماری گلی جہاں سے مڑتی تھی اس موڑ سے دو گھر آگے ایک گھر تھا۔ وہاں تین بھائی رہتے تھے۔ ان کے ماں باپ بھی تھے اور ان کی بہنیں بھی تھیں۔ تین بھائیوں میں سے بڑا بھائی تاجر تھا اور شادی شدہ۔ اس سے چھوٹا اُس وقت غالباً بی اے کر چکا تھا اور کہیں باہر چلا گیا تھا اور اس سے چھوٹا تھرڈ ایئر میں تھا۔ یہ خبر ہر روز سنائی دیتی تھی —— "آج فلاں کا لڑکا پکڑا گیا ہے ... آج فلاں کا لڑکا زخمی ہو گیا ہے .... فلاں کا لڑکا اتنے دنوں سے گھر نہیں آیا" —— ایک روز ان تین بھائیوں میں سب سے چھوٹے کے متعلق سنا کہ لاپتہ ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ کے لڑکوں نے بتایا کہ جب لاٹھی چارج ہوا تو جلوس بکھر گیا تھا پھر اس لڑکے کا پتہ نہیں چلا کہاں گیا۔ یہ بھی کسی نے سنایا کہ زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا ہے۔

میں نے ماں سے کہا کہ ذرا اس گھر ہو آؤں۔ ماں نے منع کر دیا اور ایسی بیہودہ باتیں کیں جیسے یہ لڑکا چوری کرتے پکڑا گیا ہو —— "ایسوں کے

ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیئے۔"

ایک روز ہمارے محلے میں دھماکے ہونے لگے لیکن یہ رائفلوں کے نہیں تھے۔ میری بارات آرہی تھی۔ میں کمرے میں دلہن بنی بیٹھی اپنا گھر چھوٹ جانے کے غم میں نہیں بلکہ اپنی قسمت پھوٹ جانے پر اور اپنے جذبے کی موت پر آنسو بہا رہی تھی۔ کمرہ لڑکیوں اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ شور تھا۔ گھٹن تھی۔ بارات کے گولوں کے دھماکے میرے دل کو پھاڑ رہے تھے۔ اس شور شرابے میں مجھے کسی عورت کی دبی دبی آواز سنائی دی ―― "اے و یاہ توڑ نہیں چڑھنا۔ اللہ ای خیر کرے۔"

میرا دل جو بیٹھ رہا تھا اس آواز پر ڈوب گیا۔ اس عورت نے کیوں کہا ہے کہ میری شادی اچھے انجام کو نہیں پہنچے گی؟ ―― میں خیالوں میں اس سوال کا جواب ڈھونڈنے لگی۔ کیا اس عورت کا اشارہ اُس وقت کے حالات کی طرف تھا؟ اگر اس کا اشارہ اُدھر ہی تھا تو اس نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ وقت بیاہ شادی کا نہیں جہاد کا تھا۔ قوم کے کئی گھروں میں ماتم بھی ہو رہا تھا اور میرے اپنے محلے کا ایک نوجوان لاپتہ ہو گیا تھا۔ جب قوم کو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اللہ نے پکارا تھا اُس وقت کسی کی شادی کا "توڑ چڑھنا" واقعی مشکوک تھا۔ اس عورت نے شاید یہ سوچ کر یہ بات کی ہو کہ میرے سُسرال والے اچھے لوگ نہیں، یا وہ میرے دولہا کو جانتی ہو گی۔ میں وسوسوں اور خدشوں میں ڈوب گئی۔

یوں کہہ لیں کہ میں اپنی شادی میں شریک نہیں تھی۔ جب مجھ سے پوچھا گیا کہ میں فلاں ولد فلاں کو قبول کرتی ہوں تو نہ میری زبان ہلی تھی، نہ ہاں میں سر ہلا تھا۔ پوچھنے والے چلے گئے ―― "شرم کے مارے لڑکی کے منہ سے ہاں، نہیں نکلی۔" ایجاب و قبول ہو گیا۔ فرض کر لیا گیا کہ جس کے خلاف میرے دل میں نفرت تھی اُسے میں نے قبول کر لیا ہے۔ مجھے جب ڈولی میں بٹھایا گیا تو یوں محسوس ہوا جیسے میری میت کو جنازے کی چارپائی پہ ڈال دیا گیا ہو۔

اور وہ میری شبِ عروسی تھی جب میں نے ایک لڑکی کو عروسی کے کمرے میں دیکھا۔ میرا گھونگھٹ اُسی نے اٹھایا تھا۔ میں نے شرم و حجاب کا رسمی سا اظہار بھی نہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اگر اس نے چمکیلے سے کپڑے کی شیروانی نہ پہن رکھی ہوتی تو میں کبھی نہ مانتی کہ یہ لڑکا ہے اور یہی میرا دولہا ہے۔ اُس نے سر سے ٹوپی اور سہرا اتار کر رکھ دیا تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ اُس کا جسم دُبلا پتلا اور لمبوترا تھا اور گالوں پر سُرخ دانوں کا جھرمٹ تھا۔ رنگ گندمی سے بہتر بلکہ گورا کہا جا سکتا تھا۔ گردن لمبوتری اور آنکھیں بڑی اچھی تھیں۔ نقش و نگار بھی اچھے تھے۔

"میں تمہیں بہت یاد کرتا رہا ہوں" ۔ اُس نے ایسے حجاب سے کہا جو مجھ پہ طاری ہونا چاہیئے تھا۔ کہنے لگا۔ "خدا کی قسم، میں نے تمہیں کئی دفعہ خواب میں دیکھا ہے۔"

اُس نے فلمی مکالمے بولنے شروع کر دیئے۔ میں اس رات کی ساری باتیں نہیں سناؤں گی۔ اپنی رائے بتاتی ہوں۔ میں نے تھوڑے سے وقت میں جان لیا کہ جس طرح میرے دُولہا کے جسم اور نقش و نگار میں نسوانیت سی تھی اسی طرح اس کی باتوں میں بھی مردانگی نہیں تھی۔ اگر اس میں مردانگی یا مردوں جیسی پختگی ہوتی تو مجھے اپنا گرویدہ بنا لیتا۔ میں کوئی پتھر تو نہیں تھی۔ میں بھی جوان تھی۔ تعلیم کے شوق اور قومی جذبے کے علاوہ مجھ میں بھی وہ جذبات تھے جو اُس میں تھے اور جو ہر لڑکی اور ہر جوان مرد میں ہوتے ہیں۔ وہ میرے ان جذبات کو اُبھار کر مجھے دنیا سے، میرے ارادوں سے اور میرے جذبوں سے لاتعلق کر سکتا تھا۔ نفرت کو محبت میں بدل سکتا تھا مگر اس نے زنانہ اور کھسیانہ سی باتوں اور حرکتوں سے میرے اندر یہ احساس بیدار کر دیا کہ اس کمرے میں اگر مردانگی ہے تو وہ مجھ میں ہے۔ میرے اس دولہا میں نہیں۔

جب اُس نے دیکھا کہ میں اس سے متاثر نہیں ہو رہی اور میرا ردِ عمل ٹھنڈا

ٹھنڈا ہے تو اس نے اس قسم کی باتیں شروع کر دیں ۔" میں تمہیں بڑے غضب
کے کپڑے سلوا دوں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے ابّا اور امّی سے کہا تھا کہ میں اس گھر میں
نہیں رہوں گا ۔ وہ کہتے ہیں کہ شادی کے فوراً بعد تمہیں الگ کوٹھی بنوا دیں گے ۔ سچی
بڑا مزہ آئے گا ۔ ہم دونوں الگ کوٹھی میں رہیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے گھر میں روپے
پیسے کی کوئی کمی نہیں ۔ ہم ادھار دے کر واپس ہی نہیں لیا کرتے ۔ ۔ ۔ تمہارا جہیز
والا صوفہ سیٹ اچھا نہیں تھا ۔ میں بڑے غضب کا صوفہ سیٹ بنواؤں گا ۔"
اُس نے مجھے روپے پیسے کے نشے میں بڑے " غضب " کے خواب دکھائے
اس کی ہر بات میں " غضب " تھا مگر میں نے اس میں وہ غضب نہ دیکھا جس میں
مرد کا پیار اور جذبات کا نشہ ہوتا ہے، ایسا نشہ جو عورت پر طاری ہوتا ہے تو وہ
اپنے خون کے رشتوں کو فراموش کر کے اپنے خاوند کو مجازی خدا سمجھ لیتی ہے ۔

دوسرے دن ولیمے کی صورت میں دولت کی خوب نمائش کی گئی ۔ جس پیسے
کی اُس وقت قوم کو ضرورت تھی وہ پیسہ دیگوں میں جلا کر لوگوں کو کھلا دیا گیا ۔ میں میکے
آئی ، پھر سسرال گئی ۔ میری ساس عورتوں کو میرا جہیز دکھاتی تھی تو اس کی باتوں
میں طنز سی تھی ۔ وہ یہ ضرور کہتی تھی کہ فلاں چیز نہیں ہے لیکن ہمیں کس چیز کی پرواہ
ہے ۔ انہیں ہم خود بنا دیں گے ۔ یہ باتیں میرے سامنے ہوتی تھیں ۔

جہیز کو ہر کوئی لعنت سمجھتا ہے لیکن نظریں ہر کسی کی جہیز پر ہی لگی ہوتی ہیں
لڑکی دیکھ کر رشتہ مانگا جاتا ہے ۔ لڑکی خوب صورت ہو، سگھڑ ہو، شرم والی ہو ۔ پھر
گھر دیکھا جاتا ہے کہ ساتھ کیا دیں گے ۔ لڑکی کے مقابلے میں لڑکے کی تعریفوں
کے پل باندھے جاتے ہیں خواہ وہ کاٹھ کا اُلّو اور موم کا محمد علی ہی کیوں نہ ہو ۔
میرے دولہا کی بھی تعریفوں کے پل باندھے گئے تھے مگر دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ پل صراط
ہے جس سے میں نہیں گزر سکوں گی ۔

پانچویں چھٹی رات تھی ۔ اُس رات تک میں اپنے دولہا پر غالب آ چکی تھی ۔
مٹی کے اس خوب صورت سے مادھو کو میں جان گئی تھی کہ کیا ہے ۔ اُس نے

میرے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے ۔ اس کے سوا وہ اور کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا
لیکن اپنے آپ میں وہ جو کمی محسوس کر رہا تھا اسے وہ فلمی مکالموں کے ذریعے
اور دولت کی نمائش سے پوری کرنے کی کوشش کرتا تھا ۔ پانچویں چھٹی رات
وہ اسی طرح کی کھوکھلی اور بے معنی باتیں کر رہا تھا ۔ میں نے اُسے کہا کہ انسان کا
اوڑھنا بچھونا پیسہ ہی نہیں ہوتا ۔ آپ ہر وقت مجھ پہ امیری کا رعب ڈالتے رہا
کریں ۔ یہ پیسہ بچا کر رکھیں ۔ آگے چل کر کام آئے گا ۔ اگر ہماری ایک بھی بیٹی
ہوئی تو اُسے بیاہنے میں ہی آدھی امیری ختم ہو جائے گی ۔

اُس نے عجیب طرح سے ہنس کر کہا ——— " ہمیں جہیز کی کوئی پرواہ نہیں
ہم تمہارے باپ کی طرح نہیں کہ ایک ہی بیٹی کو جہیز دے کر مقروض ہو جائیں گے
ہم دس لڑکیوں کو اتنا جہیز دے سکتے ہیں کہ دُنیا حیران رہ جائے ۔"

میں تو پہلے ہی بھری بیٹھی تھی ۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے ہاں قارون
کا خزانہ نہیں ۔ امیر ضرور ہیں لیکن اتنے نہیں جتنی بڑ ہانکتے ہیں ۔ بڑ کے نشے میں
اس نے میرے ماں باپ پر طنز کی تو میں نے اپنے غصے پر قابو پا کر اسے کہا
——— " انسان کی دولت روپیہ پیسہ نہیں ہوتی ۔ خوب صورتی سے بھی آپ
کسی کو اپنا مرید نہیں بنا سکتے ۔ آپ میں اُس دولت کی ایک رتی بھی نہیں جس
پر میں فخر کر سکتی ۔"

وہ گھبرا گیا ۔ کوئی جواب نہ دے سکا ۔ کھسیانی سی کوئی بات کرنے لگا لیکن
اس کی زبان ساتھ نہ دے سکی ۔ میری زبان کھل گئی تھی ۔ میں نے اُسے ایسی ایسی
باتیں کہ دیں جو دلہنیں پانچویں چھٹی رات ہی اپنے دولہوں سے نہیں کہ سکتیں ۔
دراصل میں اتنی دلیر نہیں تھی بلکہ وہ بزدل تھا اور وہ جانتا تھا کہ میں جو کہ رہی ہوں
وہ سو فیصد سچ ہے اور اس کا اُس کے پاس کوئی جواب نہ تھا مگر ان کڑوی باتوں
کے اثر سے وہ محفوظ نہیں تھا ۔

اُس وقت تو میں جوان تھی ۔ نفسیات سے واقفیت نہیں تھی ۔ آج اس

کی اُس وقت کی نفسیاتی کیفیت اور ردِّ عمل کو اچھی طرح بیان کر سکتی ہوں۔ اس کا چہرہ سُرخ ہوتا جا رہا تھا اور میں اس کی آنکھوں میں بے چینی دیکھ رہی تھی۔

اُس کے منہ سے عجیب ڈراؤنی سی آواز نکلی۔ وہ پلنگ پر میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہیں لڑھک گیا۔ اُس کے ہاتھ مڑ سے گئے۔ سر پیچھے کو کھچ گیا۔ آنکھیں لال سُرخ ہو کر اتنی زیادہ کھل گئیں کہ میں ڈر گئی۔ دانت بجنے لگے اور اُس کے مُنہ سے جھاگ اور خرّاٹے نکلنے لگے۔ اس کا سارا جسم اینٹھن میں تھا اور کانپ رہا تھا۔ میں نے صرف دو یا تین سیکنڈ اُسے دیکھا۔ اپنے اُوپر قابو رکھنے کے باوجود میرے مُنہ سے خوف کی ایسی چیخ نکلی کہ کمرہ کانپ اُٹھا۔

میں باہر کو بھاگی۔ اُدھر سے میری ساس، سُسر اور نندیں دوڑی آئیں۔ انہوں نے میرے دُولہا کو سنبھالا لیکن دورے میں اُس کے سنبھلنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ دورہ ختم ہوا تو وہ بے حس ہو گیا۔ ماں نے اُسے بلایا مگر وہ نہ بولا۔ اس کا باپ کچھ پڑھ پڑھ کر اُس پر پھونکیں مار رہا تھا۔

شادی سے پہلے یہ جو سُنا تھا کہ لڑکے کو دورے کا کوئی مرض ہے غلط پروپیگنڈہ نہیں تھا۔ میرے آنسو بہنے لگے اور میں دل ہی دل میں اس کے ماں باپ اور اپنے ماں باپ کو کوسنے لگی۔ میں اپنی قسمت کو رو رہی تھی۔ اپنے دولہا کے ساتھ مجھے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ ساس مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی اور کہنے لگی کہ میں کسی کے ساتھ ذکر نہ کروں کہ اس کے بیٹے کو یہ دورہ پڑا تھا۔

میں اپنے آپ میں نہیں تھی۔ میرے منہ سے نکلا کہ میں ساری برادری کو سُناؤں گی کہ مجھ پر ظلم ہوا ہے۔ پہلے اس کا علاج کرتے پھر شادی کی سوچتے۔ میں ایسی مُنہ پھٹ نہیں ہوا کرتی تھی۔ ایسی ہوتی تو میں اپنا رشتہ اس گھر کو دینے سے اپنے ماں باپ کو بدتمیزی سے اور دلیری سے روکتی لیکن میرے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس نے مجھے دلیر بنا دیا۔ میں زخمی بلّی بن گئی۔ اب تو ہر کسی کو زخمی کرنے پہ تُل گئی تھی۔ یہ میرا ایسا ردِّ عمل تھا جو میرے اپنے قابو سے باہر تھا۔

ساس نے کہا کہ یہ کوئی بیماری نہیں۔ اِسے مرگی نہ سمجھ بیٹھنا۔ بات دراصل یہ ہے کہ میرا بیٹا بہت خوب صورت ہے۔ ایک عامل نے بتایا ہے کہ اس پر ایک چڑیل عاشق ہو گئی ہے۔ ایک اور پیر نے بتایا ہے کہ دو لڑکیاں میرے بیٹے کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک نے اس پر تعویذ کرا رکھے ہیں۔ ہم اسے تعویذ پانی میں گھول کر پلا رہے ہیں۔

ساس کی ان باتوں سے میرے دل کو تسلی نہ ہوئی۔ اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ امیری اور نمائش اس کے کسی کام نہ آئی۔ اس نے میری ٹھوڑی تھام کر کہا کہ جاؤ اپنے کمرے میں سو جاؤ۔ میں نے انکار کر دیا۔ کہا کہ مجھے ڈر آتا ہے۔ ساس مجھے خوش کرنے کے لیے کہنے لگی کہ اچھا، تم یہاں سو جاؤ۔ میں اپنے بیٹے کے پاس چلی جاتی ہوں۔

میرے دولہا کی حالت دوسرے دن نارمل تھی لیکن میرے سامنے آنے سے ڈرتا تھا۔ میں نے اُسے نہ بلایا۔ اس کی ماں اور بہنوں نے محسوس کیا۔ تینوں نے میری منّت سماجت شروع کر دی۔ ان کے اس روّیے سے میرے دل میں یہ ترکیب آ گئی کہ ان کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاؤ اور انہیں اپنی جوتی کے نیچے رکھو۔ کسی اچھے سے انسان کے ساتھ بُرا سلوک کرتے رہو تو ایک نہ ایک دن وہ بُرا بن جائے گا۔ انسان پیدائشی تو بُرا نہیں ہوتا۔ میرے اندر بھی ایسا انقلاب پیدا ہوا۔ مجھ میں اپنے آپ چالاکی اور فریب کاری پیدا ہونے لگی۔ میں نے ایسا روّیہ اختیار کر لیا کہ میں خوش بھی نہیں تھی اور ناراض بھی نہیں تھی۔

اپنے خاوند کے ساتھ بھی یہی روّیہ شروع کر دیا۔ کبھی کبھی اس کی ماں اور بہنوں کے سامنے اس کے ساتھ دلچسپی کا اظہار کر دیتی۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ میں گھر کی شہزادی بن گئی۔ دورے کی دوسری ہی رات سے میں نے خاوند کے کمرے میں سونا شروع کر دیا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا ہی نہیں کہ اُسے یہ دورے کب سے پڑ رہے ہیں

اور کس قسم کے دورے ہیں اور وہ کیا علاج کر رہا ہے۔ اُس نے خود ہی بتانا شروع کر دیا۔ اس نے کہا ——— "ہم جب رنگون سے بھاگ کر بنگال آئے تو اباجان کا ایک ہندو دوست کلکتہ میں کاروبار کرتا تھا۔ اباجان نے اس کی مدد سے وہیں دکان کھول لی تھی۔ وہاں کی ایک بنگالن مجھ پر ڈورے ڈالنے لگی۔ غضب کی خوب صورت تھی۔ اس کی آنکھیں ہرنی کی آنکھوں جیسی مستانی تھیں۔ میں نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ تم نے بنگال کا جادو سُنا ہوگا۔ غضب کا جادو ہے کوئی عورت کسی آدمی کو پسند کرے اور وہ آدمی اس کے ہاتھ نہ آئے تو یہ عورت اُس کی روح کو ناریل میں بند کر لیتی ہے۔ پھر اس آدمی کو اس طرح کے دورے پڑنے لگتے ہیں جیسے کل مجھے پڑا تھا۔ وہ جو بنگالن میرے پیچھے پڑ گئی تھی اس نے مجھے کہا تھا کہ میں نے اس کا دل دُکھایا ہے اس لیے وہ مجھے چین سے نہیں جینے دیگی۔ یہ اُسی نے جادو کر دیا تھا۔"

"تو کیا ساری عمر تمہیں دورے پڑتے رہیں گے؟" میں نے پوچھا۔ میں نے اُسے آپ کہنا چھوڑ دیا تھا۔

"نہیں"۔ اس نے جواب دیا "ایک بزرگ نے تعویذ دیئے ہیں۔ دورے جلدی ختم ہو جائیں گے"۔

میں جانتی تھی وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ بنگال کے جادو کے میں نے بہت سے افسانے پہلے بھی سُنے تھے۔ اس کی ماں کہتی تھی کہ اس کے بیٹے پر ایک چڑیل عاشق ہو گئی ہے۔ دوروں کی وجہ مجھے بہت عرصہ بعد معلوم ہوئی۔ اس کے خیالات گندے تھے اور اس نے ان خیالات سے مغلوب ہو کر اپنے جسم کی حالت ایسی کر لی تھی جیسے لکڑی کو اندر سے دیمک کھا کر کھوکھلا کر دیتی ہے۔

اب اُسے آٹھویں دسویں روز دورہ پڑنے لگا۔ دورہ رات کو ہی پڑتا تھا جب میں اُس کے ساتھ ہوتی تھی۔ میں عادی ہو گئی اور مجھے ڈر بھی نہیں لگتا تھا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میرے جذبات کا کیا حال ہوتا ہوگا اور میری ازدواجی زندگی کا مستقبل

کتنا تاریک تھا۔ مجھے اُس عورت کی آواز سنائی دینے لگی جس نے شادی والے دن میرے کمرے میں کہا تھا ——— "اے ویاہ توڑ نہیں چڑھنا"۔

اُس کے دوروں سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ ساس اور نندیں مجھے سر آنکھوں پر بٹھانے لگیں۔ وہ ڈرتی تھیں کہ میں راز فاش کر دوں گی۔ میں بدکار تو نہ ہوئی لیکن مجھ میں عیاری پیدا ہو گئی۔ میں نے ایک روز اپنی ایک نند سے کہہ دیا کہ میں جس روز تنگ آ گئی میکے جا کر بیٹھ جاؤں گی اور عدالت میں درخواست دے دوں گی کہ دھوکے سے مجھے اس خطرناک مریض کے ساتھ بیاہ دیا گیا ہے۔ مجھے طلاق دلائی جائے۔

نند نے اپنی ماں کو بتایا۔ ماں نے مجھے الگ بٹھا کر میرے آگے ہاتھ جوڑے اور منت سماجت کی۔ میں نے اُسے تسلی دی اور اُس پر اپنا رُعب بھی قائم رکھا۔ آپ یوں کہہ لیں کہ میں نے سُسرال کو بلیک میل کرنا شروع کر دیا۔

مجھے دوسری رعایت یہ ملی بلکہ کھلی چھٹی یہ مل گئی کہ جب چاہتی اپنے گھر چلی جاتی اور جتنے دن چاہتی وہیں رہتی۔ میں نے ماں کو بتا دیا تھا کہ میرے خاوند کے دوروں کی خبر سچی تھی۔ اپنی ماں کو میں نے اس قدر کوسا تھا کہ وہ بھی ساس کی طرح میری منتیں کرنے لگی۔ میری ماں کو بھی اور میرے باپ کو بھی معلوم تھا کہ لڑکا دوروں کا مریض ہے کچھ عرصہ بعد مجھے اپنے خاوند سے معلوم ہوا کہ شادی کے بہت سے اخراجات میرے باپ کو میرے سُسر نے دیئے تھے اور یہ خاصی زیادہ رقم تھی۔ صحیح الفاظ میں اس طرح کہہ لیں کہ مجھے بیچا اور خریدا گیا تھا۔

آپ اپنے معاشرے کے دستور سے واقف ہیں۔ جوان لڑکے یا لڑکی کی شادی نہ ہو تو اسے اپنی بے عزتی سمجھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ لوگ باتیں بناتے ہیں۔ شادی ضرور کی جاتی ہے، لڑکا خواہ شادی کے قابل نہ ہی ہو۔ لڑکی کو بیاہ دیا جاتا ہے، خواہ میرے خاوند جیسے ذہنی اور جسمانی لحاظ سے بیکار آدمی کے ساتھ ہی بیاہ دیا جائے۔

مجھے کچھ ہوش نہیں تھی کہ ملک کی تقسیم کا اعلان کب ہوا۔ ہوا یا نہیں۔ مظاہروں اور جلوسوں کی کوئی خبر نہیں سنائی دیتی تھی۔ میں تو اپنے آپ میں الجھی رہتی تھی۔ ایک روز میں اپنے میکے گھر گئی تو معلوم ہوا کہ ہمارے محلے کا وہ لڑکا آگیا ہے جو لاپتہ ہو گیا تھا۔ میں اسے بھول ہی گئی تھی۔ ماں نے مجھے بتایا کہ اس کے متعلق پتہ چل گیا تھا کہ وہ زخمی ہے اور جیل میں ہے۔ اس کے ماں باپ اور بھائی اسے ملنے جیل گئے تو انہیں بتایا گیا کہ وہ ہسپتال میں ہے اور اس پر پولیس کا پہرہ ہے۔ ہسپتال گئے تو پولیس نے ملنے کی اجازت نہ دی۔ سفارشوں سے صرف باپ کو اجازت ملی۔ اسے بڑی ہی دردناک خبر سنائی گئی۔ اس کے نوجوان بیٹے کی ایک ٹانگ گھٹنے سے ذرا نیچے سے کاٹ دی گئی تھی اور اس کی ایک آنکھ بھی بیکار ہو گئی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی جو جڑ سکتی تھی۔ اُسے گرفتار کر کے تھانے میں لے گئے۔ وہاں سے اسی حالت میں جیل لے گئے۔ جیل والوں نے اسے قیدی کی حیثیت سے ہسپتال بھیج دیا جہاں ایک ہندو ڈاکٹر نے ہڈی جوڑنے کی بجائے ٹانگ کاٹ پھینکی۔

تھوڑے دن پہلے اُسے ٹانگ کا زخم ٹھیک ہونے کے بعد جیل میں بھیج دیا گیا اور پھر رہا کر دیا گیا تھا۔ جیل کے کسی مسلمان افسر نے اس کے گھر اطلاع دے دی تھی کہ اُسے کل فلاں وقت رہا کیا جا رہا ہے۔ باپ اور بھائی اسے تانگے میں بٹھا کر لے آئے تھے۔ ورنہ وہ ایک ٹانگ پر کیسے چل سکتا تھا۔

مجھے اب روکنے کی جرأت کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ میری ماں کو میرے سسرال کی ناراضگی کا بھی ڈر نہیں تھا۔ اس لڑکے کی بہنوں کے ساتھ میرے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ میں ان کے گھر چلی گئی۔ وہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ پاجامے میں سے اس کا ایک ہی پاؤں نظر آ رہا تھا اور اس کی آنکھوں پر رنگدار چشمہ تھا کیونکہ اس کی ایک آنکھ خراب ہو گئی تھی یا بینائی نہیں رہی تھی۔ اس کی ایک بہن اس کے پاس بیٹھی تھی۔ میں پردے کی پابند تھی لیکن اس نوجوان سے میں نے پردہ ضروری نہ سمجھا۔

میں وہیں بیٹھ گئی۔ میرا خیال تھا کہ اس کی ماں اور بہنوں کے آنسو بہ رہے ہوں گے اور یہ لڑکا (جسے میں فرضی نام سے ابرار کہوں گی۔ اصل نام کچھ اور ہے) مایوس اور غمگین ہو گا لیکن اس کے چہرے پر عجیب سی رونق تھی اور اس کی ماں اور بہنوں کے چہروں پر بھی اُداسی نہیں تھی۔

میں نے ابرار سے افسوس کا اظہار کیا۔ اس نے مسکرا کر کہا ”ہو گیا جو ہونا تھا۔ اللہ کا کرم ہوا کہ میری یہ قربانی قبول ہوئی۔ ہندوستان کی تقسیم کا اعلان ہو گیا ہے۔ ۱۴ اگست سے ہم آزاد ہوں گے۔“

”یہ کہیں چوری کرتے تو نہیں پکڑا گیا تھا۔“ اس کی ماں نے کہا۔ ”ہم نے تو اسے اللہ کے نام پر قربان کر دیا تھا۔“

اس کے والد باہر سے آئے۔ بیٹے کو دیکھ کر باندار آواز میں بولے ”کہو جوان! کیا سوچ رہے ہو؟ ...... مت سوچو۔ تم نے فتح پائی ہے۔“

میں نے اپنے آپ میں ایسی ہلچل محسوس کی جیسے مجھے اپنے خاوند کی طرح کا دورہ پڑنے لگا ہو۔ میں بیان نہیں کر سکتی کہ یہ کیا تھا۔ میرے جسم کے اندر کچھ ہو رہا تھا۔ میری نظریں ابرار کے چہرے پر جم گئیں۔ وہ درمیانے سے گھرانے کا عام سا نوجوان تھا۔ اس کا رنگ گندمی تھا۔ اس کے نقش و نگار میں ایسی کوئی دلکشی نہیں تھی کہ کوئی لڑکی اسے اس طرح دیکھنے بیٹھ جاتی جس طرح میں دیکھ رہی تھی۔ مجھے ایسے لگا جیسے وہ ابرار نہیں میں ہوں اور میری ٹانگ آزادی کے جہاد میں کٹ گئی ہے۔

میرے اندر جو ہلچل تھی وہ مجھے سمجھ آنے لگی۔ مجھے یاد آنے لگا کہ میں بھی اسی میدان میں لڑنے کو بے تاب رہتی تھی جس میدان کا یہ مجاہد ہے۔ مجھے اپنی ہم جماعت لڑکیاں یاد آنے لگیں جو مجھے سٹوڈنٹ فیڈریشن کی سرگرمیوں میں شامل ہونے کے لیے کہا کرتی تھیں اور ماں نے مجھے سختی سے روک دیا تھا۔ مجھے وہ دو لڑکے بھی یاد آئے جو ان آدمیوں کے پیچھے [illegible]

اٹھائے جلوس میں شامل ہونے کے لیے دوڑے جا رہے تھے اور عورتیں للکار رہی تھیں ——— "زندہ واپس نہ آنا..... سر کٹوا دینا"۔

مجھے خفت اور شرم محسوس ہونے لگی کہ میں اس جہاد میں شریک نہ ہو سکی۔ مجھے اپنے ماں باپ پہ اور اپنے سسرال پر غصہ آیا۔ مجھے میرے جذبے نظر آ گئے۔ یہ مرے نہیں تھے، شادی نے انہیں بُری طرح زخمی کر دیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو پہچان لیا مگر جب خیال آیا کہ سسرال والوں کو میں بلیک میل کر رہی ہوں تو میری آنکھوں میں تو آنسو نہ آئے لیکن صاف محسوس ہوتا تھا کہ میرا دل لہو کے آنسو رو رہا ہے۔ میں ابرار کو دیکھتی رہی اور بے تاب ہو کر پوچھا ——— "ٹانگ کس طرح کٹی تھی"؟

اس نے عام سے لہجے میں سُنایا کہ عورتوں کا جلوس تھا جس میں طالبات اور دیگر نوجوان لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ مرد بھی ان کے پیچھے جلوس کی صورت میں جا رہے تھے۔ کالجوں کے لڑکے مستورات کی حفاظت کے لیے ان کے جلوس کے دائیں بائیں چلے جا رہے تھے۔ ان کے آگے بھی سربکف نوجوان جا رہے تھے۔ نعرے گرج رہے تھے "بٹ کے رہے گا ہندوستان لے کے رہیں گے پاکستان" ——— اُس وقت کے پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ خضر حیات ٹوانہ کے خلاف "مردہ باد" کے بھی نعرے لگ رہے تھے۔ پولیس نے جلوس کو روکا۔ طلبہ اور سارے نوجوان مستورات کے آگے ہو گئے۔

پولیس نے رسمی اعلان کے بعد آنسو گیس پھینکی اور ساتھ ہی مردوں پہ لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ ہڑبونگ بپا ہو گئی۔ ایک لڑکی سڑک سے ہٹ کر بھاگی۔ اس کے پیچھے ایک پولیس والا دوڑا آ رہا تھا۔ وہ شاید تھانیدار تھا۔ لڑکی فٹ پاتھ پر ٹھوکر کھا کر گری۔ دو سپاہی لاٹھیاں اٹھائے دوڑے آ رہے تھے۔ تھانیدار نے گری ہوئی لڑکی کے دونو بازو پکڑ لیے۔ لڑکی پیٹ کے بل پڑی تھی۔

ابرار نے دیکھ لیا۔ وہ بہت تیز دوڑا اور تھانیدار کو اتنی زور سے دھکا دیا

کہ تھانیدار لڑکی کے بازو چھوڑ کر دُور جا پڑا۔ ابرار چونکہ دوڑتا گیا تھا اس لیے وہ سنبھل نہ سکا۔ وہ بھی گرا۔ پولیس والوں نے اُسے اُٹھنے نہیں دیا۔

تھانیدار ہندو تھا۔ اُس نے اینٹ اُٹھا کر گرے ہوئے ابرار کو پوری قوت سے ماری۔ اُس وقت ابرار پیٹھ کے بل پڑا تھا۔ اینٹ گھٹنے کے نیچے ہڈی پر لگی اور ہڈی ٹوٹ گئی۔ سپاہیوں نے اسے لاٹھیاں ماریں۔ تھانیدار نے حکم دیا کہ اسے پکڑ کر تھانے لے چلو۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے ریوالور کو نالی سے پکڑ کر دستہ ابرار کو مارا۔ دستے کے نیچے والا سرا ابرار کی آنکھ میں لگا جس سے اس کی آنکھ کچلی گئی اور بیٹھ گئی۔ اُسے ٹرک میں ڈال کر تھانے میں لے گئے۔ ٹانگ اور آنکھ پہ پٹیاں لپیٹ کر اُسے جیل میں لے گئے۔ جیل والوں نے اُسے لینے سے انکار کر دیا۔ پولیس اُسے ہسپتال لے گئی جہاں وہ زیرِ حراست رہا۔

ہسپتال میں جس ڈاکٹر نے اس کے زخم دیکھے وہ ہندو تھا۔ اس نے ابرار سے طنزیہ کہا ——— "تم بھی پاکستان بنانے مال روڈ پر گئے تھے"؟

"جی ڈاکٹر صاحب!" ابرار نے جواب دیا ——— "پاکستان تو بن کے ہی رہے گا"۔

"چلو، میں تمہیں پاکستان بنا دوں گا"۔ ڈاکٹر نے کہا۔

اور دوسرے دن اپریشن روم میں لے جا کر ڈاکٹر نے ابرار کی ٹانگ کاٹ دی۔ وہ جب ہوش میں آیا تو اُس نے اپنی ٹانگ دیکھی۔ گھٹنے کے نیچے سے غائب تھی۔ ڈاکٹر راؤنڈ پہ آیا تو ابرار نے اسے مسکرا کر کہا ——— "ڈاکٹر صاحب! دوسری ٹانگ بھی کاٹ ڈالیں۔ پاکستان تو ایک حقیقت بن کے آ رہا ہے"۔

ڈاکٹر کو شاید اپنے کیے پر ندامت ہوئی تھی۔ اس نے زخم کی مرہم پٹی ہر روز توجہ سے کی۔ اب توجہ کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ہندو اپنا کام کر چکا تھا۔ ایک آنکھ بالکل ہی بیکار ہو چکی تھی۔ آنکھ کا ڈھیلا نکال دیا گیا تھا۔ اس کے بھدے پن کو چھپانے کے لیے ابرار نے رنگدار چشمہ لگا رکھا تھا۔ نئی بیساکھیاں اسکے قریب پڑی تھیں

ابرار ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں مجھے یہ واقعہ سنا رہا تھا۔ جیسے اس کی ٹانگ کا کٹ جانا اور آنکھ کا بیکار ہو جانا کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں تھا کہ کوئی اسے توجہ سے سنتا۔ ابرار بڑ ہانک سکتا تھا۔ اُسے پُرجوش طریقے سے بازو لہرا لہرا کر یہ واقعہ سنانا چاہیئے تھا۔ اُسے حق حاصل تھا کہ اپنے کارنامے کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا لیکن وہ غالباً اس کوشش میں تھا کہ اس کی زبان سے کوئی فالتو لفظ نہ نکل جائے۔ اس کے برعکس میری ساس اور میرا خاوند تھا۔ ہر بات ڈھینگ کے لہجے میں کرتے تھے جب کہ قومی لحاظ سے ان کا کوئی مقام نہیں تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ابرار کے سامنے سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر مجھے وہاں سے اٹھنا ہی تھا۔ میں اُٹھی اور اپنے گھر کو چل دی۔

میرے ذہن میں ابرار کے سوا اور کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ میں ابرار کو دل دے بیٹھی تھی۔ یہ ایسی ویسی محبت کا معاملہ نہیں تھا۔ گھر کو جاتے کبھی تو ذہن میں آتی کہ ابرار کی جگہ میں ہوتی۔ مجھے بہت دکھ ہوتا کہ میں اس جہاد میں شریک نہیں تھی۔ کبھی یہ سوچنے لگتی کہ یہ نوجوان اب کبھی اپنے سہارے چل نہیں سکے گا۔ وہ کوئی خوبرو نوجوان تو نہیں تھا لیکن ایک آنکھ بند ہو جانے سے اس کا چہرہ بھدا ہو گیا تھا۔ ایسے ہی جذبات تھے جن میں اُلجھی ہوئی میں گھر پہنچی۔

اُس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ پاکستان کی تاریخ اپنے ان مجاہدوں سے بے خبر رہے گی۔ بھائی عبدالجبار اور زاہدہ بہن کی کہانی پڑھی تو میں اپنی کہانی صرف یہ بتانے کے لیے لکھنے بیٹھ گئی کہ پاکستان بنانے والوں میں ابرار بھی تھا۔ اور پاکستان اپنے ہزارہا ابراروں اور زاہدہ جیسی ہزاروں، لاکھوں لڑکیوں سے ناآشنا ہے۔

میں تو قوم کی تحریک پاکستان کو فراموش کئے بیٹھی تھی بلکہ حالات نے فراموش کرا دیا تھا۔ ابرار نے میرے جذبات کو زندہ کر دیا اور ذہن میں محرومی اور مجبوری کا نیا احساس پیدا کر دیا۔

ظاہری طور پر میری ازدواجی زندگی ایک ہی ڈگر پر چلتی رہی۔ میرے خاوند کو آٹھویں دسویں روز دورہ پڑتا رہا۔ ویسے وہ نارمل رہتا تھا۔ میں اس پر اتنی غالب آ چکی تھی کہ میرے اشاروں پر ناچتا تھا۔ اپنی ساس اور نندوں کے سامنے میں کبھی کبھی اس کی ہمدردی کا اظہار بھی کر دیتی اور کبھی اکتاہٹ کا اظہار کر کے انہیں ڈرا بھی دیتی۔ میں بتا چکی ہوں کہ میں انہیں بلیک میل کر رہی تھی مگر یہ احساس کانٹے کی طرح دل میں اترا رہتا تھا کہ مجھے حاصل کیا ہو رہا ہے؟ خاوند میں کوئی ذہنی اور جسمانی تبدیلی نہیں آ رہی تھی۔ میرے دل میں اس کی محبت پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی باتیں پہلے روز والی تھیں۔ صرف یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جس طرح سنا کرتی اور دیکھا کرتی تھی کہ ساسیں اور نندیں بہت بُرا سلوک کرتی ہیں میں اس بُرے سلوک سے بچی ہوئی تھی بلکہ وہ میری غلام بنی ہوئی تھیں، مگر مجھے روحانی سکون میسّر نہیں تھا۔

پھر آزادی کا دن طلوع ہوا۔ میں بیان نہیں کر سکتی کہ میرے جذبات کی حالت کیا تھی۔ میرے آنسو بہے جا رہے تھے۔ بہت روکا لیکن آنسو نہ رُکے۔ میں سسرال میں تھی۔ ساس اور نندوں نے میرے آنسو دیکھے تو پریشان ہو گئیں وہ سمجھیں شاید رات میرے خاوند کو پھر دورہ پڑا ہے۔ میں نے انہیں تسلی دی اور بتایا کہ آج ہم آزاد ہیں اور اس روز کے لیے معلوم نہیں کتنی ماؤں نے اپنے نوجوان بیٹے قربان کر دیئے ہیں اور اس آزادی میں قوم کی معلوم نہیں کتنی بیٹیوں کا خون شامل ہے...... میں جذباتی انداز میں انہیں کچھ بتا رہی تھی۔

تینوں نے سکون کا سانس لیا اور ساس ہنس کر بولی ——— "اری جاہٹ پرے۔ میں ڈر گئی تھی کہ نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ ان کے ابا پہلے ہی کہہ رہے تھے کہ پاکستان بن گیا تو بہت بُرا ہو گا۔ انگریزوں اور ہندوؤں کے ساتھ جو موج تھی وہ ان کے جانے کے بعد نہیں رہے گی۔ ہمارا کاروبار انہی لوگوں کے ساتھ چل رہا تھا۔"

میری جذباتی حالت غصّے کی نذر ہو گئی اور میں نے غصہ دبا لیا۔ تھوڑی دیر بعد میں ابرار کے گھر چلی گئی۔ میری سب سے پہلی مبارک باد کا مستحق وہی تھا۔

اُس روز تک میں کئی بار اس کے ہاں جا چکی تھی۔ ایک بار اس کی ماں نے مجھے کہا کہ تم ہم پر بہت بڑا احسان کر رہی ہو۔ ابرار کے پاس بیٹھتی ہو۔ اچھی اچھی باتیں کرتی ہو تو اس کا دل بہل جاتا ہے اور اس کا حوصلہ قائم رہتا ہے۔ اس کے دوست اسے ملنے آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہنستے کھیلتے ہیں۔ تم آتی رہا کرو۔

آزادی کے روز اُس کے گھر گئی تو اُس کی وہ کرسی خالی تھی جس پر وہ بیٹھا ہوتا تھا۔ وہاں بیساکھیاں بھی نہیں تھیں۔ مجھے دُکھ سا ہوا۔ بیٹھک میں قہقہے گونج رہے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ ابرار کے دوست آزادی کی مبارک باد دینے آئے ہیں۔ میں نے اس کی ماں سے کہا کہ میں بھی آزادی کی مبارک باد دینے آئی ہوں۔ ماں اُسے بیٹھک سے بُلا لائی۔

یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے اسے بیساکھیوں پر چلتے دیکھا۔ اس سے پہلے اُسے کرسی پر ہی دیکھا کرتی تھی۔ وہ ہنستا مسکراتا بیٹھک سے نکلا۔ میں نے دُور سے ہی آزادی مبارک کا نعرہ لگایا اور میرے آنسو نکل آئے۔ مجھے خیال آیا کہ یہ کس طرح عقاب کی طرح اُس ہندو تھانیدار پر جھپٹا ہو گا جس نے ایک لڑکی کو بازوؤں سے جکڑ رکھا تھا۔ پھر وہ پولیس سے آزاد ہونے کے لیے بھی لڑا ہو گا مگر وہ جس مقصد کے لیے لڑا تھا وہ پا لیا تو وہ ایک ٹانگ اور ایک آنکھ سے محروم ہو چکا تھا۔

"یہ تو ہنسنے کا دن ہے"۔ اس نے میرے قریب آ کر کہا ــــ "تم رو رہی ہو"۔ وہ میرا ہم عمر تھا اس لیے مجھے تم کہتا تھا اور میں بھی اُسے تم کہتی تھی۔

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں میں کیوں رو رہی ہوں"۔ میں نے کہا ــــ "یہ شاید خوشی کے آنسو ہیں ..... تم جاؤ۔ دوستوں میں بیٹھو۔ میں تمہیں مبارکباد دینے آئی تھی"۔

"پردے کا خیال نہ ہو تو بیٹھک میں آ جاؤ"۔ اس نے کہا ــــ "تین

لڑکیاں بھی ہیں"۔ اس نے اپنی ماں سے پوچھا ــــ "امی جان! میں اسے بیٹھک میں لے جاؤں؟ پھر سب لڑکیاں اندر آ جائیں گی"۔

"لے جاؤ بیٹا"۔ ماں نے کہا ــــ "دیبوں کو اپنی بہنوں کے پاس بھیج دینا"۔

میں بیٹھک میں گئی۔ تعارف ہوا۔ میں لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ یہ سب آزادی کے جہاد کے مجاہدین تھے۔ لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی۔ کیا نور تھا اُن کے چہروں پر۔ ان سب کے چہروں پر فتح کی سُرخی تھی۔

کاش! میں آج کے نوجوانوں کے چہروں پر وہی سُرخی دیکھ سکوں مگر آج کے نوجوانوں کو اپنی روایات سے بے خبر رکھ کر ایسا فحاشی پرست بنا دیا گیا کہ ان کے چہروں پر شکست کی زردی ہے۔ میرا خاوند بھی ایسا ہی نوجوان تھا جو شکست خوردگی کو روپے پیسے کی ڈھینگوں اور نمائش میں چھپانے کی کوشش کرتا رہتا تھا مگر میں جو اُس کی بیوی تھی اُس سے نفرت کرتی تھی اور یہ نفرت اسے کہاں اور مجھے کہاں لے گئی وہ میں آپ کو سناتی ہوں۔

ابرار نے مجھے جن نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں جا بٹھایا تھا ان کے چہروں پر وہی رونق تھی جو محمد بن قاسم کے چہرے پر ہندوستان فتح کر کے آئی ہو گی اور جو صلاح الدین ایوبی کے چہرے پر ہر فتح کے بعد آتی ہو گی۔ اُن خواتین کے چہروں پر بھی ایسی ہی رونق آئی ہو گی جنہوں نے رسولِ خدا صلعم کو دشمن کے گھیرے میں بچایا تھا۔ میں نے یہ نور ان لڑکیوں کے چہروں پر دیکھا جو آزادی کے روز ابرار کے کمرے میں بیٹھی تھیں۔

دس پندرہ روز بعد میں پھر ابرار کے گھر گئی۔ یوں سمجھیے کہ ابرار کا گھر میرے لیے درگاہ بن گیا تھا۔ وہاں جا کر سکون ملتا تھا۔ اُس روز گئی تو ابرار اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ مجھے اس کی بہنوں نے یہ خوشخبری سنائی کہ ابرار کی مصنوعی ٹانگ آ گئی ہے۔ میں نے اس کی مصنوعی ٹانگ دیکھی جو اس نے اُسی روز لگائی تھی۔

میں اس کے پاس بیٹھ گئی - اس کی ماں کہیں باہر گئی ہوئی تھی - ایک بہن باورچی خانے میں تھی - دوسری میرے پاس بیٹھی تھی - کچھ دیر بعد وہ میرے لیے چائے بنانے چلی گئی - ابرار نے مجھے کہا کہ وہ مصنوعی ٹانگ پر چل کے مجھے دکھاتا ہے -

اُسے ابھی چلنے کا ڈھنگ نہیں آیا تھا - وہ اُٹھا - مصنوعی ٹانگ سے دو تین قدم لیے تو لڑکھڑا گیا - رُک کر کہنے لگا کہ خاصی مشق کی ضرورت ہے کر لوں گا - میں اُٹھ کر اس کے قریب ہو گئی اور اسے چلنے کو کہا - اس نے تین چار قدم سنبھل سنبھل کر اٹھائے - میں ساتھ ہی رہی - اس ٹانگ سے وہ ذرا لمبا قدم اٹھا بیٹھا اور سنبھل نہ سکا - گرنے لگا تو میں نے اُس کی کمر میں بازو ڈال کر اُسے سنبھال لیا - اس کا ایک بازو میرے کندھے پر آگیا - وہ سیدھا ہو رہا تھا - میں اس کے جسم کا بوجھ اپنے اوپر لے رہی تھی - ہمارے گال ایک دوسرے سے مل گئے - وہ سنبھل گیا - اچانک میں نے اس کے رنگدار چشمے میں دیکھا - اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی - میری آنکھوں میں آنسو آ گئے - بے خیالی میں میرے بازو جو اس کے جسم پر لپٹے ہوئے تھے، ان کا گھیرا اور تنگ ہو گیا -

"ابرار!" میرے ہونٹوں سے روتی ہوئی سرگوشی نکلی - "ہمت نہ ہار بیٹھنا - میں تمہارے ساتھ ہوں"

"کب تک میرے ساتھ رہو گی؟" اس نے متانت سے پوچھا -

"جب تک کہو گے" میں نے کہا ——— "اپنا آپ تم پر قربان کر دوں گی اگر میری ٹانگ اور میری آنکھ تمہارے جسم کے ساتھ پیوست ہو سکتی ہے تو ابھی ہسپتال لے چلو"

اُس نے اپنی کرسی کی طرف دیکھا - تب میں نے دیکھا کہ اس کے رنگدار چشمے کے نیچے سے ایک آنسو اس کے گال پر اتر آیا تھا اور اس کے پیچھے ایک اور آنسو آ رہا تھا - میں نے اس کے آنسو اپنے آنچل میں جذب کر لیے اور جانے میرے دماغ کو کیا ہوا کہ میں نے اپنا آنچل اپنے ہونٹوں پر مل دیا - عجیب بات یہ ہوئی کہ اس کے

آنسو دیکھ کر میرے آنسو خشک ہو گئے - اس کی بہن ابھی چائے لے کر نہیں آئی تھی - میں اُسے کرسی پر لے گئی -

"تم نے جذباتی سی بات کہہ دی ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں" اس نے کہا ——— "مگر اب کوئی لڑکی میرا ساتھ نہیں دے سکے گی - تمہیں معلوم نہیں کہ دو سال گزرے میری منگنی ہوئی تھی - لڑکی والوں نے دوسروں کی زبانی میرے والدین کی خوشامدیں کی تھیں کہ ہماری بیٹی کو قبول کر لیں اور باقاعدہ منگنی ہو جائے - وہ ہو گئی - پرسوں کی بات ہے کہ لڑکی کے والدین کا پیغام آیا ہے کہ منگنی کو منسوخ سمجھیں کیونکہ تمہارا بیٹا بیکار ہو گیا ہے - میری امی نے غلطی کی کہ ان کے گھر چلی گئی اور منگنی نہ توڑنے کے لیے کہا - لڑکی کی ماں نے بڑی بدتمیزی سے کہا کہ ہم لنگڑے اور کانے کو بیٹی نہیں دیں گے - امی گھر آ کر روتی رہیں - میں نے انہیں بہلایا اور انہیں تسلی دی کہ وہ میرے غم میں پریشان نہ ہوں - اللہ کارساز ہے"

میں وہاں سے نکلی تو میرے ذہن کو یہ سوچ ڈس رہی تھی کہ ابرار جسمانی اور ذہنی لحاظ سے مکمل انسان تھا اور خاوند بننے کی اہلیت رکھتا تھا - اس کے مقابلے میں میرا خاوند جسمانی لحاظ سے مکمل تھا اور خوب صورت بھی تھا مگر اس میں خاوندوں والی کوئی صفت نہیں تھی - وہ اندھوں اور لنگڑوں سے بدتر تھا - ایسے لوگ اپنی بیٹیوں کے رشتے پیش کرتے تھے - مالی لحاظ سے ابرار کا خاندان خوشحال تھا - اس کے بڑے بھائی کا کوئی کاروبار کراچی میں تھا اور باپ کا کاروبار یہیں تھا -

میں اب تھوڑے تھوڑے دنوں کے وقفے سے ابرار کے گھر جانے لگی - ابرار مصنوعی ٹانگ پر اچھی طرح چلنے لگا مگر وہ ہر وقت یہ ٹانگ باندھ کے نہیں رکھ سکتا تھا - اسے ٹانگ اتارنی پڑتی اور گھر میں بیساکھیوں پر چلنا پڑتا تھا - تین ماہ بعد اُس نے اپنے والد کی دکان پر جانا شروع کر دیا - اُسے کہیں نوکری کرنے کی ضرورت نہیں تھی - ان کی دکان اتوار کو بند ہوتی تھی، اس لیے میں اتوار کے روز اس کے گھر جاتی تھی - معلوم نہیں یہ وہی افسانوں یا فلموں والی محبت تھی یا

کیا تھا۔ میں اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہوں کہ ابرار میرے ذہن میں سما گیا تھا اور بعض اوقات مجھے یقین سا ہو جاتا تھا کہ میں ابرار کی خدمت کے لیے پیدا ہوئی ہوں۔

وہ بھی سمجھ گیا تھا کہ میں اس کے گھر اس کی بہنوں کے پاس نہیں بلکہ اُس کے پاس جاتی ہوں اور میری ہمدردی رسمی نہیں دلی ہے۔ لیکن اُس نے کبھی کوئی گھٹیا سی بات نہیں کی تھی۔ البتہ ہماری بے تکلفی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس نے میرے سامنے رنگدار چشمہ کبھی نہیں اتارا تھا۔ ایک روز میں نے اسے چشمہ اتارنے کو کہا تو وہ بولا ——— "نہیں۔ آنکھ بہت بُری لگتی ہے۔" میں نے اپنے ہاتھ سے اس کا چشمہ اتار دیا۔ اُس کی آنکھ واقعی بہت بھدّی لگتی تھی۔ صرف پپوٹے تھے جن میں سے اوپر کے پپوٹے پر زخم کا بھدّا سا نشان تھا۔ ڈھیلا نہیں تھا۔ پپوٹوں کے درمیان تھوڑا سا خلا تھا۔ اگر یہ آنکھ کسی اور کی ہوتی تو میں دیکھتے ہی منہ پھیر لیتی لیکن یہ آنکھ پاکستان پر قربان ہوئی تھی اس لیے مجھے اس کا بھدّا پن اچھا لگا مگر میرا چہرہ اُداس ہو گیا۔

"میں نے کہا تھا نا، چشمہ نہ اتارو۔" اس نے رنجیدہ لہجے میں کہا ——— "اب تم میرے پاس نہیں بیٹھا کرو گی۔"

"مجھے آنکھ پر افسوس ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "کہو تمہارے کتنے قریب بیٹھوں۔ اگر میری شادی نہ ہو چکی ہوتی تو ....."

"تو تم میرے ساتھ شادی کر لیتیں۔" مجھے اس کے یہ الفاظ اچھی طرح یاد ہیں۔ اس نے مجھے پوری بات نہیں کرنے دی تھی۔ ٹوک کر بولا ——— "یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں۔ تمہاری شادی نہ ہو چکی ہوتی تو تم میرے قریب بھی نہ آتیں۔"

میں اُسے کوئی جواب نہ دے سکی۔ ایک دو ماہ بعد پتہ چلا کہ اس کی ماں نے دو گھروں سے ابرار کے لیے رشتے کی بات کی تو دونوں نے لڑکے کو اپاہج کہ کر رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ یہ ایسی چوٹ تھی جسے ابرار آسانی سے برداشت نہ کر سکا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ جانتا ہے کہ اُسے کوئی رشتہ نہیں دے گا۔ اس نے کہا ——— "مجھے اس حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ مجھے اب اکیلے جینا ہے میں نے اپنے جذبات کو کچلنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ میں اپنے آپ کو مارنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ پھر میں مشین کی طرح کام کیا کروں گا۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔" میں نے اُسے کہا ——— "تم اکیلے نہیں رہو گے۔" میں نے کہ تو دیا لیکن مجھے احساس تھا کہ میں کھوکھلی باتیں کر رہی ہوں۔ اگر طلاق لینی آسان ہوتی تو میں خاوند سے طلاق لے کر ابرار کے ساتھ شادی کر لیتی۔

کچھ اور وقت گذرا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ تنہائی کو محسوس کر رہا ہے۔ وہ جوان تھا۔ صحت مند تھا۔ وہ اپنے جذبات کو نہیں دبا سکتا تھا۔ کوشش ضرور کر رہا تھا۔ اس کا طریقہ اُس نے یہ اختیار کیا تھا کہ فلاسفروں کی طرح باتیں کرنے لگا تھا۔ ایسے حقیقت پسند جوان کو بوڑھے فلاسفروں کی طرح باتیں کرتے دیکھا تو مجھے اچھا نہ لگا۔ وہ دراصل اپنی محرومی کے پیدا کردہ خلا کو پُر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آپ میرے خلاف جو بھی فتویٰ دیں میں اسے قبول کر لوں گی لیکن جھوٹ نہیں بولوں گی ——— میں نے ایک روز، جب مجھے اس کے ساتھ دو تین منٹ کی تنہائی میں بات کرنے کا موقعہ مل گیا، اسے کہا کہ وہ اوپر والے کمرے میں منتقل ہو جائے۔ ان کے مکان کی بالائی منزل پہ ایک کمرہ اور برآمدہ تھا۔ میں نے اُسے صاف کہ دیا کہ میں اس کے پاس تنہا بیٹھنا چاہتی ہوں۔ اُس نے پس و پیش کی۔ یہ بھی کہا کہ تم شادی شدہ ہو ——— ہماری نیت کتنی ہی پاک کیوں نہ ہو، کسی نے دیکھ لیا تو طوفان بپا ہو جائے گا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں ڈھیٹ اور دلیر ہو چکی ہوں۔ میرے ساتھ جو دھوکہ ہوا ہے اس نے مجھے فریب کار بنا دیا ہے لیکن میں کوئی گناہ نہیں کروں گی۔

"کیا میں یہ سمجھوں کہ تمہارے دل میں میری محبت ہے؟" اس نے پوچھا۔

"شاید وہ محبت نہ ہو جس کی طرف تمہارا اشارہ ہے"۔ میں نے کہا — "میں اپنے جذبات کو اتنا ہی سمجھ سکی ہوں کہ جس جہاد میں تم اس حال کو پہنچے ہو میں اس جہاد سے محروم رہی ہوں۔ اس کی بجائے مجھے ایک بیکار آدمی کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے۔ میں دل سے تمہارے ہر دکھ کی دوا بننا چاہتی ہوں۔ اس سے مجھے ایسی تسکین ہوتی ہے جیسے میں جہاد میں شریک ہوں"۔

میری شادی کو ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزر گیا تھا۔ ابرار اوپر والے کمرے میں چلا گیا تھا۔ میں وہاں جاتی۔ کچھ دیر اس کی ماں اور بہنوں سے گپ شپ لگاتی پھر اوپر چلی جاتی۔ اس طرح ہمیں تھوڑی سی تنہائی مل جاتی۔ وہ دل کی وہ باتیں کرتا جو وہ اپنی ماں اور بہنوں کے ساتھ نہیں کر سکتا تھا اور میں اس کے دل کو مایوسی سے بچانے کی کوشش کرتی تھی۔

اُدھر میرے سسرال والے کچھ اور امید لگائے بیٹھے تھے۔ ایک سال سے اوپر عرصہ ہو گیا تھا، مجھ میں ماں بننے کے آثار ظاہر نہیں ہو رہے تھے — میری نندوں نے لجاجت سے مجھے کہا — "آپا! آپ تو ابھی تک کنواریوں کی طرح بے فکر گھوم پھر رہی ہیں۔ ہم تو گھر کی رونق میں اضافے کی امید لگائے بیٹھی ہیں"۔ — میں نے ہنس کے ٹال دیا۔ پھر ایک روز ساس نے اسی امید اور مایوسی کا اظہار کیا۔ میں نے اسے بھی ٹال دیا مگر ان کی امید مطالبے کی صورت اختیار کر گئی اور دو تین مہینوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ ساس مجھے شکی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ مجھے یہ لوگ ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔

ایک رات میرے خاوند نے بھی کہہ دیا کہ بچہ ہونا چاہیئے۔ میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا تو وہ جھینپ گیا۔ کھسیانہ سا ہو کر بولا — "امّی کہتی تھی کہ کسی لیڈی ڈاکٹر کو گھر بلا کہ تمہارا معائنہ کرائیں گے"۔

مجھے طیش آ گیا۔ میں نے کہا — "ماں سے کہنا کہ پہلے تمہارا معائنہ کرائے۔ تم نے اُسے بتایا نہیں کہ بچہ کیوں نہیں ہوتا؟ اپنی ماں کو اور بہنوں کو بتا دو تاکہ وہ جھوٹی امید نہ لگائے رکھیں۔ تمہارا بچہ کبھی پیدا نہیں ہو گا۔ ایک کی بجائے دس شادیاں کر لو"۔ اور میں نے اُسے کچھ بیہودہ باتیں بھی کہہ دیں جو سب سچ تھیں۔

تین چار راتیں گزریں تو ایک رات پھر اُس نے بچے کا قصّہ چھیڑ دیا۔ یہ دراصل اوچھے سے لوگ تھے۔ میں نے اُسے پہلے سے زیادہ سخت باتیں کہہ دیں اور یہ بھی کہا — "تمہیں بنانے والا فرشتہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ لڑکا بنائے یا لڑکی۔ تم جیسے کیسے بنے، خدا نے تمہیں دنیا میں اتار دیا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہارے دوروں کا باعث کیا ہے مگر تم تعویذ باندھے پھرتے ہو اور جھوٹ بولتے پھرتے ہو کہ چڑیل عاشق ہو گئی اور ایک بنگالن نے جادو کر دیا ہے.... کان کھول کہ سُن لو۔ میں اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاؤں گی۔ جب تم میرے قابل ہو جاؤ گے تو مجھے لے آنا۔ بہتر یہ ہے کہ مجھے طلاق دے دو، ورنہ میں خود عدالت میں چلی جاؤں گی اور وہاں یہ ثابت کر کے کہوں گی کہ تم ذہنی اور جسمانی مریض ہو اور مجھے تم سے طلاق دلوائی جائے"

میں نے اتنے عرصے سے جو غصہ روکا ہوا تھا وہ نکل آیا۔ مجھے اپنے اوپر قابو نہ رہا۔ اُس کی آنکھیں اُبل آئیں اور وہ بے بس ہو گیا۔ صبح ہوئی۔ وہ اپنے کام پر چلا گیا تو میں اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ عدالت میں جاؤں گی۔ میرے باپ میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ باپ اور ماں نے میرا آئے دن کا رونا سُن کر مجھے کہہ دیا تھا کہ ہم نے تمہیں بیاہ دیا ہے۔ اب مرو یا جیو، ہمارا فرض پورا ہو گیا ہے۔

میں دو دن سسرال نہ گئی۔ اگلے روز جانے کا ارادہ تھا مگر اگلے روز اطلاع آئی کہ میرا خاوند مر گیا ہے۔ میں دوڑی گئی۔ وہ واقعی مر چکا تھا۔

مجھے اُس عورت کی بات یاد آئی ——— "اے ویاہ توڑ نیئں چڑھنا" ———
میں نے اُس کی میّت دیکھی - چہرہ نیلا ہو گیا تھا - معلوم ہوا کہ رات سویا اور صبح
مرا ہوا پایا گیا - موت کا سبب یہ دورہ بتایا گیا لیکن یہ جھوٹ تھا - اس نے
کچھ کھا کر خود کشی کی تھی - اُسے خودکشی ہی کرنی چاہیئے تھی - آپ جب اخباروں
میں یہ خبر پڑھتے ہیں کہ ایک آدمی نے گھریلو جھگڑوں سے "تنگ" آکر خود کشی
کر لی، اور یہ کہ تھوڑا ہی عرصہ ہوا اُس کی شادی ہوئی تھی تو اس میں کوئی
گھریلو جھگڑا نہیں ہوتا - اصل وجہ صرف اُس کی بیوی کو معلوم ہوتی ہے -

میرے خاوند کی میّت چونکہ تیزی سے خراب ہو رہی تھی اس لیے اُسے
جلدی دفن کر دیا گیا - مجھے برادری میں کھسر پھسر ہوئی جو چالیسویں سے پہلے پہلے
ختم ہو گئی - چالیسویں کے بعد میں اپنے میکے چلی گئی - میری ابھی عمر ہی کیا تھی
ماں روتی اور یہی کہتی تھی کہ اب تمہارا بیاہ کہاں کریں گے - میں اُسے کہہ کہہ کر
تھک گئی کہ میں اب شادی نہیں کروں گی لیکن ماں کے دل کو میں اپنے
سینے میں کیسے ڈالتی -

تین مہینے گزر گئے - میں نے ایک روز ماں سے پوچھا ——— "اگر
ابرار کی ماں میرا رشتہ مانگنے آئے تو مان جاؤ گی؟"

"ہائیں" ماں نے حیران ہو کر کہا ——— "کیا تمہارے لیے یہی
لنگڑا اور آنکھوں کا اندھا رہ گیا ہے؟"

"میرے مرے ہوئے خاوند سے سو درجے اچھا ہے" ———
میں نے کہا ——— "مجھے تو بُرا نہیں لگتا"

"خبردار" ماں نے میرے مُنہ میں ہاتھ دے کر کہا ——— "پھر
کبھی اس کا نام نہ لینا - لوگ کہیں گے کمبختوں کو بیٹی اتنی بھاری لگی کہ اپاہج
کے حوالے کر دی"

مگر یہ فیصلہ میرا تھا اور اب میں مکمل طور پر ڈسپریٹ ہو چکی تھی - باپ نے

سنا تو اس نے مجھے وہ ڈانٹ پلائی کہ گھر کی دیواریں کانپنے لگیں - ماں نے مجھ
پر پابندی عائد کر دی کہ میں ابرار کے گھر نہ جایا کروں - میں نے اُسے صاف کہہ دیا کہ
مجھے وہاں جانے سے روکو گے تو پچھتاؤ گے - میں تمہاری مرضی پر قربان ہو چکی
ہوں - ڈیڑھ سال کی جو اذیّت میں نے سہی ہے وہ تم نہیں سہہ سکتی تھیں - اب
میری مرضی چلے گی، یا مجھے گھر سے نکال دو -

میں ابرار کے گھر جاتی رہی اور اپنی ماں کے ساتھ میری نوک جھونک ہوتی
رہی - میں نے ایک روز ابرار سے لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ دیا کہ میں اُس کے ساتھ
شادی کرنا چاہتی ہوں جو نہیں ہو سکتی مگر شادی کرنی ضرور ہے - اُس نے مجھے
اس ارادے سے باز رکھنے کو بہت کچھ کہا لیکن میں ڈٹی رہی - میں اب آپ کو
یہ نہیں سناؤں گی کہ اُس نے کیا کہا اور میں نے کیا کہا ورنہ میری کہانی فلمی کہانی بن
جائے گی - وہ چونکہ حقیقت پسند تھا اس لیے بار بار کہتا تھا کہ میں جذبات کے
تحت یہ فیصلہ کر رہی ہوں اور میں اُسے یہ کہہ رہی تھی کہ میں اُسی کی طرح حقیقت
پسند ہوں - میں نے اُسے یہ بھی کہا تھا ——— "میں نے پہلے روز تمہیں
دیکھا تو میرے دل نے مجھے کہا تھا کہ تم ہی اس کی بیساکھی ہو مگر مجھے پتہ نہیں
چل رہا تھا کہ میں اندھے کی لاٹھی اور معذور کی بیساکھی کیسے بن سکتی ہوں اب
میں تمہیں تنہا زندگی بسر نہیں کرنے دوں گی - تم یہ نہیں کہہ سکو گے کہ پاکستان
کے لیے اتنی بڑی قربانی دے کر تمہیں پاکستان نے کچھ نہیں دیا"

دوسری یا شاید تیسری ملاقات میں فرار کا ارادہ پکا ہو گیا - ابرار نے
گھر والوں کو بتائے بغیر اپنے کراچی والے بڑے بھائی کو خط لکھا جس میں ساری
بات کھل کر لکھ دی - بڑے بھائی کے ساتھ اس کی دوستانہ سی بے تکلفی تھی -
معذوری کی وجہ سے یہ بھائی اس کا بہت خیال رکھتا تھا ..... ساتویں آٹھویں
روز کراچی سے جواب آ گیا ——— "آ جاؤ"

ایک روز ابرار گھر یہ بتا کر نکلا کہ دوستوں سے ملنے جا رہا ہے - میرے

لیے گھر سے نکلنے کے کئی بہانے تھے - میں ابرار سے ریلوے سٹیشن پہ ملی اور ریل گاڑی نے ہمیں کراچی پہنچا دیا - ابرار نے بھائی کو تار دے دیا تھا - وہ کراچی چھاؤنی کے سٹیشن پر موجود تھا - اُس نے اپنی بیوی کو اعتماد میں لے لیا تھا - تیسرے روز ہمارا نکاح پڑھا دیا گیا اور ابرار اپنے بھائی کے ساتھ کام کرنے لگا -

میں نے اپنے ماں باپ کو خط لکھ کر انہیں بتا دیا کہ میں کہاں ہوں اور میں نے شادی کر لی ہے - تھوڑے عرصے بعد ابرار کے ماں باپ نے اس کی یہ خطا معاف کر دی لیکن مجھے میرے ماں باپ نے نہ بخشا - اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں - اللہ انہیں بخشے - میری ساس اور سُسر بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں - میرے بھائی بیویوں بچوں والے ہو گئے ہیں - وہ شاید مجھے بھول چکے ہوں گے - میں اب اپنے بچوں اور ابرار میں مگن رہتی ہوں -

زاہدہ کی کہانی پڑھی تو ابرار نے کہا ——— " آؤ ہم اپنی کہانی لکھتے ہیں " -

ہم دونوں بیٹھ گئے اور مل کر کہانی مکمل کر لی - یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ میں مُجرم کی بیوی ہوں یا مجاہد کی ؟

پاکستان - ایک پیاز دو روٹیاں

پچھلے سال انہی دنوں میرے گھر میں سفیدی ہو رہی تھی - گھر بڑا اور سفیدی کرنے والا اکیلا تھا . کام ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا - میں نے ایک روز سفیدی کرنے والے کو دیکھا - وہ صرف اکیلا ہی نہیں تھا بلکہ اُس کا بایاں بازو بھی پوری طرح کام نہیں کرتا تھا - بائیں ہاتھ کی گرفت انگلیاں بے کار ہونے کی وجہ سے نہ ہونے کے برابر تھی اور وہ بوڑھا بھی تھا - صرف ایک مزدور اُس کی مدد کرتا تھا - اُس نے جب میرے گھر میں سفیدی شروع کی تھی ، میں اُسے پہلی بار دیکھ رہی تھی - میں اُسے بڑے گھر والیوں کی طرح غصّے سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ کام جلدی ختم کرے ورنہ ایک دو اور سفیدی کرنے والے لے آئیں گے ، مگر اُس نے جب میری طرف دیکھا تو میں اُسے کچھ بھی نہ کہہ سکی - وہ معذور تھا - اس سے زیادہ کام نہیں کر سکتا تھا -

میرے ذہن میں یہ سوال تڑپ اُٹھا ——— " ہم نے ایسا پاکستان کیوں بنایا تھا جس میں ایک معذور بوڑھا صرف زندہ رہنے کے لیے ایسی مشقت کر رہا ہے جو اُس سے ہو نہیں سکتی ؟ "

میں نے اُسے کچھ بھی نہ کہا - اپنے کمرے میں آ گئی اور میری یادیں مجھے تیس سال پیچھے لے گئیں - میں اپنے بچوں کو فخر سے بتایا کرتی تھی کہ پاکستان بنانے

والوں کی فہرست میں میرا بھی نام آتا ہے - ان دنوں جب پچھلے سال، ہمارے گھر کی سفیدی ہو رہی تھی تو میں نے سفیدی کرنے والے کو دیکھ کر اپنے بچّوں کو جنگ آزادی کی کہانی تفصیل سے سنائی - انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں یہ کہانی لکھ کر کسی رسالے کو دوں - میں اس خیال سے چُپ رہی کہ ایسی کہانی کونسا رسالہ شائع کرے گا جس میں عشق و محبّت کی چاشنی نہیں، تفریح کا چسکا نہیں اور جو ذرا سی لذّت مہیا نہیں کرتی - آخر نظر "حکایت" پہ پڑی اور یہ روئیداد قلم بند کر کے اس توقع پر سپردِ خدا کر دی کہ یہ مجھے "ناقابلِ اشاعت" کے لیبل کے ساتھ واپس مل جائے گی - میں اس کی اشاعت کی توقع رکھ بھی نہیں سکتی کیونکہ اس میں صلاح الدّین ایوّبی کی حقیقی کہانیوں والی ولولہ انگیزی اور فکر انگیزی نہیں اور اس میں قابلِ احترام احمد یار خان صاحب کی جُرم و سزا کی کہانیوں جیسا سسپنس نہیں - میری تحریر بھی ان جیسی نہیں -

میری روئیداد میں کوئی نیا پن بھی نہیں - میری جوانی کے دَور کے بہن بھائیوں کے لیے جنہوں نے پاکستان بنایا تھا یہ کہانی قطعاً اچھوتی نہیں ہو گی کیونکہ ایسے بہت سے واقعات ہوئے تھے جو میں آپ کو سنانے لگی ہوں - البتہ آج کی نئی پود کے لیے کچھ باتیں ناقابلِ یقین ہوں گی - "حکایت" میں اکثر طلبا طالبات اور نوجوانوں کے ان جلوسوں کا ذکر آتا ہے جو انہوں نے جنگ آزادی کے سلسلے میں ۴۷ - ۱۹۴۶ میں نکالے تھے - آپ نے پڑھا ہو گا کہ انگریز کی پولیس اُن پر کس قدر اور کس قسم کا تشدّد کرتی تھی - جلوسوں پہ لاٹھی چارج اور آنسو گیس کے حملے تو سڑکوں پہ ہوتے تھے، ایک حملہ اور بھی تھا جو راتوں کو ہوتا تھا - کسی بھی مسلمان گھرانے کے دروازے پہ دستک ہوتی - دروازہ کھلتا تو باہر پولیس کھڑی ہوتی - گھر کے نوجوان لڑکے کو پکڑ کے لے جاتی - ایسے لڑکوں پہ جلوسوں کی قیادت کا الزام ہوتا تھا - ان پر کوئی مقدمہ نہیں چلتا تھا - تھانوں کی حوالاتوں میں ان کی ہڈیاں توڑی جاتی تھیں - لالچ بھی دیئے جاتے تھے - پھر انگریز بادشاہ کو رحم

آ جائے تو رہائی کا حکم دے دیتا تھا یا جیل خانے میں بند کر دیتا تھا - بربریّت کے اس عمل میں کئی ایک طلبہ ہمیشہ کے لیے لاپتہ ہو گئے تھے -

انہی دنوں کا ذکر ہے جب لڑکیوں نے سیکرٹریٹ میں انگریز گورنر کے دفتر پہ برطانیہ کے جھنڈے کی جگہ مسلم لیگ کا جھنڈا چڑھا دیا تھا - یہاں میں ایک غلط فہمی رفع کرنا چاہتی ہوں - یہ جھنڈا پاکستان کا یا مسلم لیگ کا باقاعدہ پرچم نہیں تھا - جو لڑکی لڑکوں کی مدد سے اوپر چڑھی تھی، اس نے اپنا سبز دوپٹہ سر سے اتار کر رسّی سے اُس پول کے ساتھ باندھ دیا تھا جہاں یونین جیک (برطانیہ کا جھنڈا) چڑھایا جاتا تھا - میں اس جلوس اور مظاہرے میں شامل تھی - اس لڑکی کو گرفتار نہیں کیا جا سکا تھا کیونکہ لڑکے اُسے کسی دوسرے راستے سے اپنی حفاظت میں باہر لے گئے تھے - پیچھے ہم پر پولیس نے لاٹھی چارج کیا جس میں لڑکیاں زخمی ہو گئی تھیں - اُن دنوں ہر مسلمان لڑکی گہرے سبز رنگ کا دوپٹہ سر پہ رکھتی تھی - اگر پاکستان کے تھانوں میں اُس دور کے ریکارڈ تلف نہیں کر دیئے گئے تو ان میں آپ کو بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں کے نام "مشتبہ" اور "خطرناک" کے زُمرے میں لکھے ہوئے نظر آئیں گے -

جہادِ آزادی کی یہ داستان بہت ہی طویل ہے - میں آپ کو اس کا ایک اور پہلو دکھانا چاہتی ہوں جو اختصار سے بیان کرتے ہوئے یوں ہے کہ پنجاب میں انگریزوں کی حامی اور پروردہ سیاسی جماعت یونینسٹ پارٹی تھی جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی - یہ وہ مسلمان تھے جنہیں انگریز کی حکومت نے وفاداری کے صلے میں مربعے اور جاگیریں عطا کی تھیں - ان میں بعض جاگیریں ۱۸۵۷ء میں اپنی قوم سے غدّاری اور مجاہدین کے خلاف مُخبری کے صلے میں دی گئی تھیں - جہلم، راولپنڈی اور کیمبلپور جیسے فوجی ضلعوں کے بیشتر لوگ فوجی پنشن لیتے تھے اور ان میں سے بہت سے ایسے تھے جنہیں نہری علاقوں میں مربعے دیئے گئے تھے - یہ لوگ انگریز کے خلاف آواز نکالنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے - ان میں کچھ ایسے تھے جنہوں نے

مطالبۂ پاکستان کی مخالفت شروع کر دی اور مسلم لیگ کے کارکنوں کو اس قسم کی دھمکیاں دیں کہ وہ ان علاقوں میں پروپیگنڈے کے لیے گئے تو انہیں قتل کر دیا جائیگا۔ اپنی جاگیروں کے مزارعوں کو اور اپنی عملداری میں رہنے والے کسانوں کو بھی انہوں نے دھمکیوں سے مرعوب کر دیا تھا۔

ہم نے ہاتھ میں قرآن رکھ کر پاکستان کی آزاد سرزمین کے نام پر ووٹ مانگے تھے۔ قرآن اور لا الہ الاللہ کے تقدس نے یونینسٹ پارٹی کی دھمکیوں اور رعب کو سرد کر دیا اور پوری قوم ایک محاذ پر برسرِپیکار ہو گئی۔ اس کے باوجود جاگیرداروں کی خاصی تعداد مسلمان ہوتے ہوئے بھی قوم کے خلاف رہی۔ اُن کی جاگیروں میں مزارعوں اور کسانوں نے شہریوں کی نسبت زیادہ قربانیاں دیں۔ وہ زمینوں سے محروم ہوئے۔ اپنے ہاتھوں بیجی ہوئی فصلوں سے محروم ہوئے۔ اُن کے پانی بند کر کے اُن کی کھیتیاں ویران کر دی گئیں اور اُن کے گھروں میں غنڈوں کے حملے اور ڈکیتی کی وارداتیں بھی ہوئیں، مگر انہوں نے قوم کا ساتھ نہ چھوڑا۔

ایک پہلو اور بھی تھا جس کا تعلق چار دیواری کی دنیا کے ساتھ تھا۔ بعض برادریوں میں کیفیت یہ تھی کہ کسی عورت کے سُسرال یونینسٹ پارٹی کے تھے اور میکے مسلم لیگی۔ عورت کو خاوند اور اس کے باپ نے حکم دیا کہ وہ الیکشن میں یونینسٹ امیدوار کو ووٹ دے گی۔ یہی حکم لڑکی کے والدین کو اس دھمکی کے ساتھ دیا گیا ——— "ورنہ ہم لڑکی کو طلاق دے دیں گے۔"

یہ محض دھمکیاں نہیں تھیں۔ کئی سہاگنوں کے سہاگ اجاڑ دیئے گئے، بعض بیویوں نے یہاں تک اعلان کر کے کہ میرا خاوند مجھ پر حرام ہے کیوں کہ وہ قرآن کی بجائے انگریز کا وفادار ہے، اپنے میکے جا بیٹھیں۔ بعض مسلم لیگی خاوندوں نے یونینسٹ یا کانگرسی سُسرال سے قطع تعلق کرنے کے لیے بیویوں کو طلاقیں دے دیں اور ایسے خاوند بھی تھے جو سمجھتے تھے کہ میاں بیوی جدا نہیں ہونا چاہتے تھے۔ دونوں پاکستان کے حامی تھے مگر اُن کے بزرگوں نے انہیں اجاڑ دیا۔ آج کے نوجوانوں کے

لیے شاید جنگِ آزادی کا یہ پہلو حیران کن اور ناقابلِ یقین دکھائی دے لیکن یہ حقیقت ہے کہ دیہاتی علاقوں، چکوں اور قصبوں میں آج بھی ایسی بوڑھی عورتیں نظر آتی ہیں جنہیں ۱۹۴۶ء میں طلاقیں ملیں یا انہوں نے طلاقیں لے لی تھیں۔

میں اُن دنوں کالج کے دوسرے سال میں تھی۔ میرے گھرانے کا تعلق اُس برادری سے تھا جس میں زمینداری اور جاگیرداری تھی۔ ان میں سے تین چار گھرانے ہمارے گہرے رشتہ دار تھے۔ یہ لوگ شہروں میں بھی رہتے تھے اور اُن دیہات میں بھی جہاں اُن کے مربعے اور جاگیریں تھیں۔ اُن کے ہاں تعلیم واجبی سی تھی۔ وہ لوگ سوشل حیثیت کا معیار کچھ اور سمجھتے تھے۔ اُن کے ہاں انگریز ڈپٹی کمشنر کا آنا بہت بڑی سوشل حیثیت کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ ہماری بھی تھوڑی سی اراضی تھی جو اباجان نے بٹائی پر دے رکھی تھی اور ہم خود شہر میں رہتے تھے جہاں آج بھی ہمارے تین مکان ہیں۔ دو کرائے پر دے رکھے ہیں اور ایک میں میرے دو بھائی اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتے ہیں۔

اباجان نے تعلیم حاصل کی اور ملازم ہو گئے تھے۔ ان کے خیالات برادری سے الگ تھلگ تھے، مگر برادری کی زنجیروں سے آزاد ہونا اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔ ہمیں برادری کی نیکی بدی اور دُکھ سکھ میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ برادری ہماری اونچ نیچ میں ہمارا ساتھ دیتی تھی، لیکن یہ کوئی خوبی نہیں تھی کیونکہ بیشتر رسومات فرسودہ، بے معنی اور تکلیف دہ تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہمارے دادا فوت ہوئے تو اُن کی تدفین کے بعد ہمارے ہاں سات بکرے ذبح ہوئے، زردہ پکا اور دعوت کی فضا ویسی جیسی تھی۔ اباجان کی روشن خیالی انہیں ان پابندیوں سے آزاد نہیں کر سکتی تھی۔

جب جنگِ آزادی کا عروج شروع ہوا تو میں کالج میں تھی۔ میرے بھائیوں کی دلچسپیاں اور تعلیم سے ہٹ کر اس جہاد پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ دوسرے لڑکے اور لڑکیوں کی طرح وہ بھی بہت کام کرتے تھے۔ اباجان کی انہیں پوری حمایت اور حوصلہ افزائی

حاصل تھی - میں جس کالج میں پڑھتی تھی وہاں ہندو اور سکھ لڑکیاں بھی تھیں - کہا جاتا ہے کہ ہندو بھی انگریزوں سے آزادی چاہتا تھا لیکن صرف آزادی مسلمان چاہتے تھے - ہندو کے دو مقاصد تھے - ایک انگریز سے آزادی دوسرے مسلمانوں پر حکومت - ہندو ایسی آزادی چاہتے تھے جس میں مسلمان اُن کے غلام ہو جائیں - کالج میں ہندو اور سکھ لڑکیاں ہمیں پیار اور محبّت سے کانگرس میں شامل کرنے کی کوشش کرتی تھیں - اُن کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی اور وہ وقت آ گیا جب قائداعظمؒ نے ڈائریکٹ ایکشن کا حکم دے دیا -

یہ اگست ۱۹۴۶ کا واقعہ ہے - سارے ملک میں مسلمانوں نے جلوس اور مظاہرے شروع کر دیئے - ان میں ریلوے سٹیشنوں پر قبضہ کر کے ریل گاڑیوں کو روکنے کے علاوہ پولیس سٹیشنوں، کچہریوں، سرکاری دفاتر اور عمارتوں پر قبضہ کر کے انگریز کی مشینری کو روک دینا شامل تھا - تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ انگریز نے اس کے جواب میں کس قدر تشدّد کیا ہو گا - جیل خانے بھر گئے تھے اور مسلم لیگ کے سرکردہ کارکنوں کو پولیس ڈھونڈتی پھرتی تھی، پکڑ کر تھانے لے جاتی، بے دردی سے زد و کوب کرتی اور پھر جیل میں بند کر دیتی یا ایک بار پھر پکڑ لینے کے لیے رہا کر دیتی -

یہ جہادِ آزادی کا فیصلہ کن مرحلہ تھا - لڑکیاں بھی میدان میں نکل آئیں - پنجاب اور سرحد کے بڑے بڑے شہروں میں لڑکیوں کے بھی جلوس نکلنے لگے - پنجاب میں یہ سلسلہ زیادہ شدید تھا کیونکہ یہاں یونینسٹ وزارت تھی جس کا لیڈر خضر حیات ٹوانہ تھا - ہمیں حکم ملا تھا کہ اس کی وزارت کی نافرمانی کرنی ہے - اس سے پنجاب کے مسلمانوں پر ایک تو انگریزی حکومت کا تشدّد تھا، دوسرا ٹوانہ وزارت کا - لڑکیوں کو بھی پولیس نہیں بخشتی تھی - لاٹھیوں اور آنسو گیس سے اکثر لڑکیاں بیہوش ہو جاتیں اور سڑکوں پر پڑی رہتی تھیں - انہیں گھسیٹ گھسیٹ کر پولیس کے ٹرکوں میں ڈالا جاتا تھا - اگلے جلوس میں لڑکیوں کی تعداد پہلے سے زیادہ ہوتی تھی - یہ تفصیلات ایسی ہیں جو آج کی نئی پود کو ذہن نشین کرانا بہت ضروری ہے لیکن

میں کچھ اور سنانا چاہتی ہوں - والدین اپنی بچیوں اور بچوں کے لیے پریشان تو رہتے تھے لیکن وہ انہیں روکتے نہیں تھے بلکہ حوصلہ افزائی اور فخر کرتے تھے - میری امّی کے خیالات کچھ اور تھے، ابّا جان نے مجھے اس محاذ میں شامل ہونے کی کھلی اجازت دے دی تھی -

میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں جس کی ذاتِ باری نے جہاں مجھے شکل و صورت کی دلکشی اور جسمانی پھرتی عطا کی ہے وہاں عقلِ سلیم سے بھی نوازا ہے - میں نے اپنی سرگرمیاں جلوسوں میں صرف شرکت تک محدود نہ رکھیں بلکہ قیادت بھی سنبھال لی - محلّوں میں جا کر لڑکیوں کو جمع کرنا، جلوس سے پہلے اُن کے دوپٹے بھگونے کا انتظام کرنا تا کہ آنسو گیس جلد اور آنکھوں پر اثر نہ کرے، جلوس کے دوران اور پولیس کے تشدّد میں لڑکیوں کو منظم رکھنا اور مسلم لیگ کے مرکزی دفتر سے پروگرام اور احکام لینا اور ایسے کئی ایک کام تھے جو مجھے اور چند دوسری لڑکیوں اور لڑکوں کے ساتھ مل کر کرنے پڑتے تھے -

اکثر اوقات رات دیر تک کام کرنا پڑتا تھا - لڑکے ہمیں گھروں تک چھوڑ جاتے تھے - وہ لڑکے آج کل کے لڑکوں کی طرح ہی تھے لیکن اُن میں آج کے لڑکوں اور لڑکیوں والی بے ہودہ عادتیں نہیں تھیں - اکیلے اکیلے لڑکے رات کے وقت اکیلی اکیلی لڑکی کو تاریک راستوں سے گھروں تک لے جاتے تھے - کبھی کسی لڑکی نے کوئی شکایت نہیں کی تھی اور کسی لڑکی کے گھر والوں نے کبھی شک بھی نہیں کیا تھا - یہ الگ بات ہے کہ کسی لڑکی اور لڑکے میں چاہت یا محبّت پیدا ہو جائے لیکن کبھی کوئی فلمی ڈرامہ نہیں کھیلا گیا تھا -

مجھے ایک لڑکا اچھا لگتا تھا - اس کا نام حمید تھا - بہت کام کرتا تھا - اس کے متعلق پتہ چلا کہ کبھی کبھی رات کو بھی لیگ کے دفتر میں رہتا اور کام میں لگا رہتا ہے - طبیعت کا سادہ اور مالی لحاظ سے غریب تھا - اُس نے یہ ڈیوٹی مستقل طور پر اپنے ذمے لے لی کہ مجھے دیر ہو جاتی تو میرے گھر تک میرے ساتھ جاتا تھا - میں اسے کہتی

تھی کہ تانگے پر چلتے ہیں تو وہ پیدل چلنے کو کہتا تھا۔ ایک روز میں نے اصرار کیا تو اُس نے کہا —— "میرے پاس تانگے کے لیے پیسے نہیں ہوتے اور مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ جس لڑکی کی حفاظت کے لیے میں جاؤں اُس کی جیب سے پیسے خرچ کراؤں۔ اگر آپ پیدل نہیں چل سکتیں تو میں کسی اور لڑکے کو بھیج دیا کروں گا۔"

اس کا انداز ایسا ٹھہرا ٹھہرا، متین اور دو ٹوک تھا کہ میں نے پیدل چلنا اور اُسی کو ساتھ رکھنا پسند کیا۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے اس لیے جھینپ جاتا تھا کہ مجھے امیر ماں باپ کی بیٹی سمجھتا تھا۔ اس کا لباس پاجامہ اور معمولی سے کپڑے کی قمیض تھا۔ پاؤں میں سستے سے چپل ہوتے تھے۔ اس نے ایف۔ اے پاس کر لیا تھا۔ اب بی۔ اے کی پرائیویٹ تیاری کر رہا تھا، لیکن جنگِ آزادی میں ایسا گم ہوا کہ تعلیم ترک کر دی۔ کالجوں کے مسلمان طلبا نے کالجوں میں جانا چھوڑ دیا تھا۔

ایک رات میں نے اُسے گھر پہنچ کر روک لیا۔ ابا جان سے تعارف کرایا۔ آپ نے بیٹھنے کو کہا۔ وہ نہیں بیٹھا۔ اسے کھانے کے لیے رُکنے کو کہا۔ وہ نہیں رُکا۔ مجھے معلوم تھا کہ اُس روز ہم نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ ایک جلوس میں مصروف رہے تھے۔ اُس روز بڑا شدید لاٹھی چارج ہوا تھا۔ حمید کہیں گر پڑا تھا۔ اس کے پاجامے پر مٹی کی رگڑ تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ یہ نوجوان ہارا تو نہیں لیکن تھکا ہوا اتنا اور بھوکا اتنا ہے کہ پیدل گھر تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اس کے باوجود وہ میرے گھر نہیں رُکا۔

دوسرے دن اُسے لیگ کے دفتر میں دیکھا تو مجھے غصہ آگیا۔ میں نے اُسے ایک طرف لے جا کر کہا —— "حمید، تمہارے اصول اتنے مضبوط پتھر کے بنے ہوئے ہیں کہ ٹوٹ نہیں سکتے؟ تم میرے ابا جان کے کہنے پر بھی کھانے کے لیے نہ رُکے۔ تم جانتے ہو کہ میں اطمینان سے کھانا نہیں کھا سکی؟ مجھے معلوم تھا تم نے کھانا نہیں کھایا تھا۔"

اُس کی مسکراہٹ مجھے آج تک یاد ہے۔ وہ ایک اُداس مسکراہٹ تھی۔

اُس نے کہا —— "آپ ٹھیک کہتی ہیں، میرے اصول پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ میں خود بھی پتھر بن جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ مجھ پر یہ کرم کریں کہ مجھے میری ذات اور میری حیثیت سے باہر نہ گھسیٹیں۔ میں نے آپ کے ساتھ جانے سے پہلے کھانا کھا لیا تھا۔ میں گھر سے پیاز کا ایک گنڈا لے آتا ہوں۔ دوپہر اور شام کے درمیان کسی نانبائی سے ایک آنے کی دو روٹیاں لیتا ہوں اور پیاز سے کھا لیتا ہوں۔ یہ میرا دونوں وقت کا کھانا ہوتا ہے۔" —— وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا —— "جس روز پاکستان وجود میں آجائے گا، میں آپ سے کہوں گا کہ آج میں آپ کے گھر کھانا کھاؤں گا۔ مجھے مرغی کھلائیں۔" —— اُس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "میں نے مرغی کبھی نہیں کھائی۔ کبھی انڈہ بھی نہیں کھایا۔"

وہ تو ہنس پڑا مگر میرے آنسو نکل آئے۔ میں نے اُسے اور کچھ نہیں کہا۔ میں جان گئی کہ لڑکا سخت جان ہے اور اصولوں کا بھی سخت ہے۔ پاکستان کے نام پر فدا ہو ہو جاتا تھا۔ گھوڑوں کی طرح بھاگ دوڑ کرتا اور تھکتا نہیں تھا۔ اور وہ جو کھاتا تھا وہ میں آپ کو بتا چکی ہوں۔ ایک روز میں نے سٹوڈنٹ فیڈریشن کے ایک عہدیدار سے کہا کہ حمید کو کھانا تو کھلا دیا کریں۔ اُس نے کہا کہ حمید کا شمار تحریک کے چند ایک غیر معمولی طور پر مخلص، ذہین اور ہر طرح کی قربانی دینے والوں میں ہوتا ہے۔ سب کے کھانے کا انتظام کبھی دفتر کی طرف سے ہوتا ہے اور کبھی امیر ماں باپ کے لڑکے اپنی جیبوں سے انتظام کر دیتے ہیں لیکن حمید کہتا ہے کہ پاکستان بننے تک دو روٹیوں اور پیاز کے سوا کچھ نہیں کھاؤں گا۔ اس عہدیدار نے بتایا کہ یہ بڑا غریب لڑکا ہے لیکن غربت کے متعلق اس کے نظریات باوقار ہیں۔

اس دوران میرے نیلام کی بولیاں شروع ہو گئیں۔ میری برادری کی عورتیں آنے لگیں۔ ایک روز تین عورتیں آئیں۔ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھتی تھیں۔ میں اُن کی نظریں سمجھتی تھی۔ ابا جان نے ابھی میری شادی کے متعلق یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ جلدی کر دی جائے گی۔ ماؤں کو بیٹیوں کا غم ضرورت سے زیادہ ہی لگا

رہتا ہے۔ یہی حال میری ماں کا تھا۔ عورتیں مجھے دیکھنے آئیں تو وہ پھولی نہیں سماتی تھی۔ میں اُن میں سے کسی کو نہیں جانتی تھی۔ امّی نے مجھے اُن کے مربعوں کی پیمائش، نوکروں چاکروں کی تعداد، مکان کی وُسعت اور خوبصورتی اور اردگرد کے دیہات پر اُن کی حکمرانی اور انگریز افسروں میں مقبولیت کی تفصیلات جھوم جھوم کر سنائیں۔

اُس دَور میں لڑکیاں بھائیوں اور باپوں کے ساتھ اپنی شادی کے متعلق بات کرنے کی جرأت نہیں کرتی تھیں۔ میں بھائیوں کی حمایت شرم کے مارے حاصل نہ کرسکی۔ آج کے دَور میں یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ اتنی کُھلی پھرنے والی لڑکی میں شرم بھی تھی؟ —— جی ہاں، ہمارے دَور کا کُھلا پھرنا آج کے دور کی آزادی سے بہت مختلف تھا۔ ہمارے سامنے بہت ہی بلند اور قرآن جتنا مقدّس مقصد تھا جو قوم کے لیے زندگی اور موت کا سوال بن گیا تھا۔

مجھے ان لوگوں پر غصہ آیا کہ قوم انگریز جیسے جابر اور ظالم بادشاہ اور ہندو جیسے عیّار دُشمن کے خلاف زندگی اور موت کا معرکہ لڑ رہی ہے اور ان لوگوں کو شادی کی سُوجھی ہے۔ ان عورتوں نے میرا انٹرویو بھی لیا۔ وہ تین دن ہمارے گھر رہیں۔ دو دن تو امّی نے مجھے باہر نہ نکلنے دیا۔ تیسرے دن مَیں نے امّی سے کہا کہ الیکشن ختم ہونے سے پہلے مَیں شادی نہیں کروں گی۔ مسلمانوں کے لیے ۱۹۴۶ء کے انتخابات بہت اہم تھے۔ ہمارے امیدوار پاکستان کے اِیشو پر کھڑے ہوئے تھے۔ اگر ہم الیکشن ہار جاتے تو پاکستان کی پیدائش غیر یقینی ہو جاتی۔

امّی نے مجھے خاندان کی عزت کے نام پر شادی کے لیے قائل کرنا شروع کر دیا۔ میں نے امّی کو دھوکہ دیا کہ مجھے باہر جانے دیں، مَیں راضی ہو جاؤں گی۔ مَیں نے بُرقعہ اوپر ڈالا اور عورتوں کو یہ بتا کر باہر نکل گئی کہ کالج جا رہی ہوں۔ میں بہت پریشان تھی۔ شادی کے لیے میں تیار نہ تھی۔ اُس دَور کا نعرہ "رہے کے رہیں گے پاکستان" میرے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا۔

ہر مسلمان کی یہی کیفیت تھی۔

اُس روز لیگ کا کوئی ہنگامہ خیز پروگرام نہیں تھا۔ کارکن آئے ہوئے تھے۔ اگلے جلوس اور مظاہرے کے لیے لوگوں کو اطلاعیں دینی تھیں۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ کام ہو نہ ہو آج رات دیر سے گھر جاؤں گی تاکہ میرے رشتے کے لیے جو عورتیں آئی ہیں وہ مجھے آوارہ سمجھ کر نامنظور کر دیں اور چلی جائیں۔ جنگِ آزادی تو میری ایک مجبوری تھی۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ میں جاگیرداروں کے گھر نہیں جانا چاہتی تھی۔

اُس وقت تک میری حمید کے ساتھ اتنی بے تکلّفی ہو چکی تھی کہ اُس کے ساتھ میں دل کی بات کر سکتی تھی۔ دفتر سے فارغ ہو کر مَیں اُسے باہر لے گئی اور ایک جگہ جا بیٹھے۔ مَیں نے اُسے بتایا کہ کوئی معجزہ نہ ہو گیا تو ایک آدھ دن میں میرا رشتہ طے ہو جائے گا۔ پھر جلدی ہی میری شادی ہو جائے گی۔

اُس نے چونک کر میرے منہ کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر دیکھتا رہا۔ مَیں نے اُس کے چہرے پر درد اور کرب کا نمایاں تاثر دیکھا۔ اُس نے سرگوشی میں کہا —— "مُبارک ہو" —— اُس نے آہ بھری اور بولا —— "آپ کے بھائی خوش نصیب ہیں۔"

اُس کے اس ردِّ عمل نے مجھے چونکا دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میری شادی کی خبر سُن کر اُسے افسوس ہوا تھا۔ اُس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ مجھے کہتا کہ تم نے میرے خواب بکھیر دیئے ہیں۔ اُس میں ایسی جرأت آ ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ اسے اپنی غریبی کا اعتراف تھا اور مجھے امیر باپ کی بیٹی سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بڑے پختہ اصولوں کا پابند تھا مگر محبت کا اظہار نہ کر سکنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ دل میں محبت کا وجود ہی نہیں۔ آپ کسی کے ہونٹ سی سکتے ہیں، اُس کے احساسات پہ پہرے نہیں بٹھا سکتے۔ حمید نے اپنے ہونٹ سی لیے تھے لیکن اُس کے احساسات باغی ہو کر اُس کے چہرے پر آ گئے تھے۔

میں نے اپنے آپ سے کہا کہ میرا بس چلے تو ان جاگیرداروں کو ٹکا سا جواب دے کر اس غریب سے نوجوان کے ساتھ شادی کر لوں۔ اس کے پاس روپیہ پیسہ اور زمین نہیں تھی۔ وہ جذبات اور ایمان کی دولت سے مالا مال تھا۔ میں نے آپ کو تفصیل سے بتایا نہیں کہ وہ حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں کیسی دیوانگی اور جنون کی کیفیت میں کام کرتا تھا۔ وہ دلیر اتنا تھا کہ ایک لاٹھی چارج کے دوران اُس نے ایک کانسٹیبل سے لاٹھی چھین کر اُسی کے سر پہ دے ماری تھی۔ لڑکوں نے اُسے اِدھر اُدھر چھپا کر بھگا دیا تھا ورنہ وہ جیل خانے میں ہوتا، اور یہی دلیری اُس نے دوسری بار بھی کی اور پکڑا گیا تھا۔

اُس پر خاموشی طاری تھی۔ میں نے کہا —— "میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

اُس نے پھر میرے چہرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ اب تو اُس کے چہرے پہ درد اور دُکھ کا تاثر اور زیادہ گہرا اور نمایاں ہو گیا تھا۔ میرے ہونٹوں پہ یہ الفاظ آ گئے تھے —— "تمہیں افسوس ہو رہا ہے حمید؟ تم میرے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہو"؟ —— لیکن میں نے ایسی بات کہی نہیں کیونکہ ہم ایک دوسرے سے چوری چھپے ملنے کے لیے گھروں سے نہیں آئے تھے۔ ہم پکنک منانے نہیں آئے تھے، نہ ہم تفریح کے موڈ میں تھے۔ اور پھر مجھ میں ایسی کھلی بات کہنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ شرم اور حجاب مانع تھا لیکن میرے اندر جو احساس بیدار ہوا اُسے میں اپنے آپ سے چھپا نہ سکی۔ میں نے موضوع بدل دیا لیکن حمید جو ہر موضوع پہ نہایت مدلّل اور دانشمندانہ باتیں کیا کرتا تھا، نہ جانے خیالوں ہی خیالوں میں کہاں جا پہنچا۔ اُس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں میرے ساتھ باتیں کیں۔

سُورج غروب ہونے لگا تو میں گھر آ گئی۔

امّی نے پہلی خبر یہ سنائی کہ اُس نے ان عورتوں سے میرے رشتے کا وعدہ بھی کر لیا ہے۔ ابّا جان نے رضامندی کا اظہار کر دیا تھا۔ میں چپ ہو رہی۔ مجھ میں اتنی شرم اور عقل تھی کہ میں نے اپنا ردِّعمل سینے میں روک لیا۔ میں جانتی

تھی کہ برادریوں کی پابندیاں مذہب اور قوم کی پابندیوں سے زیادہ سخت ہوتی ہیں۔ چار دیواری کا جہنم اِنہی رسومات اور بے جا پابندیوں سے گرم رہتا اور انسانوں کو جلاتا رہتا ہے۔ برادریوں میں جکڑے ہوئے لوگ خدا کو ناراض کر لیتے ہیں، اُس کے بندوں کو ناراض نہیں کر سکتے۔ خدا تو بخشنے والا مہربان ہے۔ ہاتھ پھیلا کر بخشش مانگو تو بڑے بڑے گناہ بخش دیتا ہے، مگر اس کے بندے اپنے قدموں میں سجدے کرا کے بھی نہیں بخشتے۔

میں نے ابّا جان کی زبان اور عزت پہ قربان ہونے کا عہد کر لیا اور ظاہر تک نہ ہونے دیا کہ میں نے انگارے نگل لیے ہیں۔ امّی نے مجھے کہا کہ میں باہر جانا چھوڑ دوں کیونکہ یہ عورتیں میرے باہر جانے پر خوش نہیں تھیں۔ میں نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا اور کہا —— "امّی جان! میں نے آپ کی خوشی پر اپنی خوشی قربان کی ہے۔ اس کے عوض تھوڑی سی خوشی مجھے دے دیں۔ جب تک ممکن ہو سکے مجھے باہر جانے سے نہ روکیں۔ میرے ساتھ ایسی لڑکیاں جلوسوں وغیرہ میں ہوتی ہیں جن کی منگنیاں ہو چکی ہیں۔ ان میں سے دو نے شادیاں ملتوی کرا لی ہیں"۔

ابّا جان کے ساتھ امّی نے بات کی تو مجھے اجازت مل گئی۔ بھائیوں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ وہ تحریکِ پاکستان کے صفِ اوّل کے مجاہد تھے۔ انہیں تو یہ دیکھنے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔

چند دنوں بعد باقاعدہ منگنی ہو گئی۔ میرے ہونے والے سُسر نے کہا تھا کہ سُنا ہے لڑکی سیاست میں عملی دلچسپی لیتی ہے جو قابلِ اعتراض ہے۔ میرے ابّا جان نے جواب دیا تھا کہ لڑکی جب آپ کے گھر چلی جائے گی تو آپ ہر طرح کی پابندی عائد کر دیں۔ میرے گھر میں جب تک ہے میں اسے سیاست سے الگ نہیں ہونے دوں گا۔

سنا ہے مردوں میں اس موضوع پر گرما گرم بحث ہوئی تھی۔ دو بزرگوں نے

فیصلہ کرا دیا تھا ۔ میری شادی تو کہیں نہ کہیں ہونی ہی تھی ۔ مجھے اعتراض کا حق حاصل نہ تھا ۔ البتہ یہاں یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگا کہ مجھے کٹڑ غلام خاندان میں بھیجا جا رہا ہے جہاں انگریز کو دیوتا اور ان داتا سمجھا جاتا ہے مگر فرار کا کوئی راستہ نہ تھا ۔

حمید کو منگنی کی خبر سنائی تو اس کا ردِ عمل وہی تھا جو رشتے کی خبر پر ہوا تھا ۔ میرا دل بوجھل تھا ۔ دل کی باتیں کرنے کی ضرورت نے میری زبان کھول دی ۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اس گھر میں جانا نہیں چاہتی ۔

"آپ احمق ہیں،" اس نے کہا ۔ "شادی طے ہو گئی اور آپ ناراض ہیں ۔"

میں جلی بھُنی ہوئی تھی ۔ میں نے جھنجھلا کر کہا ـــــ "حمید، خدا کے لیے مجھے آپ نہ کہا کرو ۔ تم مجھ سے سال دو سال بڑے ہی ہو گے ۔ مجھے تم کہا کرو تاکہ میں ذرا کھل کر بات کر سکوں ۔" ـــــ لیکن وہ مجھے آپ ہی کہتا رہا ۔ میں نے کہا ـــــ "تمہارے دل میں جو ہے وہ میرے سامنے رکھ دو ۔ تم میرے رشتے کے فیصلے پر خوش نہیں ہوئے تھے ۔ میری منگنی پر بھی خوش نہیں ہو ۔ تم مجھے وہ بات کہہ کیوں نہیں دیتے جو تمہارے دل میں ہے ۔"

"کہہ دُوں؟" اس نے پوچھا ـــــ "ہم پاکستان کے نام سے ایک آزاد اور الگ تھلگ خطۂ زمین کیوں حاصل کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے اُسے مختصر الفاظ میں جواب دیا تو اس نے کہا ـــــ "ہندوستان کا ہر مسلمان یہی جواب دے گا جو آپ نے دیا ہے ۔ مسلمان آزاد نہیں تو وہ مسلمان بھی نہیں ۔ ہم ایک جدا قوم ہیں ۔ میں مسلمان کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کر رہا ہوں ۔ اس فرض کی ادائیگی میں جان کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کروں گا ۔ مجھے سب کہتے ہیں کہ میں سرفروش ورکر ہوں، مگر کبھی کبھی مجھے یہ احساس شرمسار کر دیتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اپنی ذات کے لیے کر رہا ہوں اور اپنی ان دو بہنوں کے لیے کر رہا ہوں جو گھر میں بیٹھی کنواری بوڑھی ہو جائیں گی کیونکہ میں ان

کے لیے جہیز نہیں بنا سکوں گا .....

"میں ایک بڑھئی کا بیٹا ہوں ۔ میرا باپ اتنا کاریگر نہیں ہے کہ اعلیٰ قسم کا فرنیچر بنا کر بہت سے پیسے کما سکے ۔ کھڑکیاں دروازے بنا لیتا ہے یا چھوٹا موٹا ٹھوکا ٹھکائی کا کام کر لیتا ہے ۔ میں اس کا اکیلا بیٹا ہوں ۔ ایک بہن مجھ سے دو سال بڑی ہے اور دوسری دو سال چھوٹی ۔ بڑی شادی کی عمر میں داخل ہو کر آگے نکلی جا رہی ہے اور چھوٹی تیزی سے جوان ہو رہی ہے ۔ باپ نے مجھے اپنا کام سکھانا چاہا لیکن میں نے پڑھنے کا خبط سوار کر لیا ۔ سکول میں داخل ہوا ۔ چونکہ دل چسپی تھی اس لیے اتنی ذہانت ظاہر کی کہ ماسٹروں نے فیس آدھی معاف کر دی .....

"آٹھویں نویں جماعت میں مجھ میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ مجھے باپ کے کندھے سے لڑکیوں کا بوجھ ہٹا کر اپنے کندھوں پر لینا ہے ۔ میں اِسی عمر میں سنجیدہ ہو گیا تھا ۔ میں تو کھیلا کُودا بھی نہیں ...... دس جماعتیں پاس کر لیں ۔ وظیفے کی اُمید تھی ۔ صرف بارہ نمبروں کے فرق سے وظیفے سے محروم رہا ۔ باپ نے کہا کہ کہیں نوکری کر لو ۔ میں نے کہا کہ دو چار جماعتیں اور پڑھ لوں تو آپ مجھے زیادہ قیمت پر بیچ سکیں گے ۔ باپ لڑکیوں کے غم میں گھُل رہا تھا ۔ اُسے میرا ارادہ اچھا لگا ۔ میں نے ایف ۔ اے بھی کر لیا لیکن نیم فاقہ کشی کی حالت میں .....

"سٹوڈنٹ فیڈریشن نے تحریکِ پاکستان میں عملی حصہ لینے کا اعلان کیا تو میں اس محاذ پر آ گیا ۔ مطالبۂ پاکستان کو میں نے دل میں بٹھا لیا ۔ اپنی غربت اور اپنی ذمہ داریوں کو نظر انداز کر کے میں جس طرح اس تحریک میں کام کر رہا ہوں وہ آپ دیکھ رہی ہیں مگر یہ خیال کئی بار دل میں آیا ہے کہ میں اس جہاد میں قرآن اور خدا کی عظمت کے لیے شریک نہیں ہوا ۔ مجھے پاکستان کے متعلق یہ باتیں پسند آئی ہیں کہ یہ اللہ کی سرزمین ہو گی جہاں اسلامی قانون ہو گا ۔ ہندوؤں سے لی ہوئی رسمیں اور بیہودہ رواج ختم ہو جائیں گے ۔ انسان انسان پر حکمرانی نہیں کرے گا ۔

کوئی کسی کا حق نہیں مارے گا ۔ معاشرہ شریعت کے اصولوں کا پابند ہوگا اور اس میں جہیز پر بھی پابندی ہوگی ۔ اسلامی اصولوں کے تحت جہیز کی لعنت ختم ہوجائے گی ۔ پھر کوئی لڑکی گھر میں بیٹھی بارات کے انتظار میں بوڑھی نہیں ہوگی۔ کوئی غریب باپ اور کوئی مجھ جیسا بھائی بہنوں کے جہیز کے لیے فاقے نہیں کرے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

”مجھے شاید پاکستان کا یہی پہلو اچھا لگتا ہے کہ میری دونوں بہنیں سونے کے زیورات اور قیمتی کپڑوں کے بہت سے جوڑوں اور ہزاروں روپے کے سامان کے بغیر بیاہی جائیں گی اور میرے بوڑھے باپ کی کمر سیدھی ہوجائے گی اور میری ماں کے بال اِتنی تیزی سے سفید نہیں ہوں گے ۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ پاکستان کے حصول کے لیے اسی لیے دیوانہ ہوا جارہا ہوں کہ میں سستے داموں ذمہ داریوں سے فارغ ہوجاؤں گا اور مجھے روزگار بھی مل جائے گا ۔ میں نوکری کی کوشش کرچکا ہوں ۔ کہیں نہیں ملی ۔ جنگ ختم ہوچکی ہے ۔ جو عارضی محکمے صرف جنگ کے لیے بنائے گئے تھے وہ توڑے جارہے ہیں ۔ فوج سے لوگوں کو نکالا جارہا ہے ۔ میٹرک کے بعد میرا ارادہ تھا کہ نوکری بھی کروں گا اور پڑھوں گا بھی ، مگر بے روزگاری بڑھتی جارہی ہے ۔ اس کے علاوہ میں مسلمان ہوں ۔ سرکاری اور غیر سرکاری ادارے ہندوؤں کے ہاتھ میں ہیں ۔ وہ مسلمانوں کو نوکری نہیں دیتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

”میں جہیز نہیں بنا سکتا ، اور میں اپنی بہنوں کو کسی ایسے گھر میں نہیں بھیج سکتا جہاں جہیز کا مطالبہ نہ ہو مگر کھانے کو انہیں کچھ نہ ملے اور ساری عمر یہ طعنے بھی سنتی رہیں کہ ساتھ کیا لائی ہیں ۔ میں اتنی جلدی پاکستان بنانا چاہتا ہوں جتنی قائداعظم کو بھی توقع نہیں ۔“ آپ نے افسوس کا اظہار کیا تھا ۔ میرے سامنے میری بہنیں آ گئی تھیں ۔ اب آپ کہتی ہیں کہ آپ کی منگنی ہوگئی ہے لیکن آپ شادی نہیں کرنا چاہتیں ۔ مجھے آپ کے افسوس پر افسوس ہوا تھا ۔ ایک میری بہنیں ہیں جن کی شادی معلوم نہیں ہوگی یا نہیں ۔ ایک آپ ہیں کہ شادی ہورہی ہے اور آپ انکار کررہی ہیں ۔ آپ کے والدین کو جہیز کا کوئی غم نہیں ۔ برادری کی دعوت کے اخراجات کا غم نہیں ۔ رشتے کا پیغام آیا اور منگنی ہوگئی ۔“

وہ بہت دیر ایسی باتیں کرتا رہا ۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ خود غرض نہیں ہے ، اُس کا جہاد اپنی ذات اور اپنی بہنوں کے لیے نہیں ، خدا کے لیے ہے ۔

اُس نے مجھ سے پوچھا —— ”اگر پاکستان مل گیا تو کیا آپ کو یقین ہے کہ وہاں کوئی فاقہ نہیں کرے گا اور جہیز کا بھوت قوم کے سر سے اُتر جائے گا ؟“

میں نے اُسے یقین دلایا تو اُس پر خاموشی طاری ہوگئی اور پھر ہم گھروں کو چلے گئے ۔ میں رات کو اسی کے متعلق سوچتی رہی ۔ بہنوں کی شادی اس حد تک اُس کے ذہن پر سوار تھی کہ وہ سمجھتا تھا کہ وہ جنگ آزادی بھی بہنوں کے سہاگ کے لیے لڑ رہا ہے ۔ میری رائے ایسی نہیں تھی ۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ وہ جانباز جوان تھا ۔ انگریز اور ہندو کو اپنا اور اسلام کا دشمن سمجھتا تھا اور اس کا کردار اسلام کی تصویر تھا ۔

میری شادی کا دن مقرر ہوگیا ۔ صرف دس دن باقی تھے ۔ جنگِ آزادی فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوچکی تھی ۔ میں جب سوچتی تھی کہ میری شادی اس وقت ہورہی ہے جب میرے ساتھیوں پر لاٹھیاں برس رہی ہیں اور وہ گرفتار ہورہے ہیں تو میرے دل میں تیر اُتر جاتا تھا ۔

اسی ذہنی کیفیت میں میری شادی ہوگئی ۔ دُلہن بننے کو جی نہیں چاہتا تھا ۔ سہیلیوں نے بنایا سنوارا اور سجایا اور میں نے برادری میں والدین کی عزت رکھنے کے لیے اپنا آپ قربان کردیا ۔ دُولہا کے پاس پہنچی تو اُس نے پہلا حکم یہ دیا کہ آج سے تمہاری سیاسی سرگرمیاں ختم ہیں اور اب تم پاکستان کا نام نہیں لوگی ۔ تم جب میکے جاؤ تو میں یہ نہ سنوں کہ تم مسلم لیگ یا سٹوڈنٹ فیڈریشن کے دفتر میں گئی ہو ۔ ابھی تمہارے ہاں الیکشن ہونے والا ہے ۔ تمہارا اور تمہارے گھر کا ایک بھی ووٹ

مسلم لیگ کے بکس میں نہیں جائے گا۔

میں پہلے ہی جلی بھُنی بیٹھی تھی۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے کہا ——— "آپ کو میرے جسم کا مالک بنایا گیا ہے، میرے ایمان کا نہیں۔ میں ایسی کوئی پابندی قبول نہیں کروں گی۔"

بہت دیر اسی مسئلے پر جھک جھک ہوتی رہی۔ وہ پہلی جنگِ عظیم کے ایک ریٹائرڈ رسالدار کا بیٹا تھا۔ انگریزوں نے اس گھرانے کو وفاداری کا بہت انعام دیا تھا۔ میرے دُولہا کی تعلیم کُل نو جماعت تھی۔ اُس نے مجھے اپنی لونڈی سمجھا اور رات بھر لونڈیوں جیسا سلوک کیا۔ میری بات سمجھنا تو درکنار اُس نے اسی پر غصّہ جھاڑ دیا کہ میں بات کر کے اس کی گستاخی کی مرتکب ہو رہی ہوں۔ وہ مجھے حکم دے رہا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا ——— "میری جاگیر میں کسی کو جرأت نہیں کہ پاکستان کے نام پر پرچی ڈالے۔"

میں آخر لڑکی تھی۔ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ رات گزار دی لیکن دل نفرت سے بھر گیا۔ دوسرے دن اس کے بوڑھے باپ نے میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہا ——— "میں نے تمہارے باپ کو سمجھا دیا تھا کہ انگریز سے تم لوگ ٹکر نہیں لے سکتے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ انگریزوں نے ابھی ابھی جرمنی جیسے طاقتور ملک کو شکست دی ہے۔"

مختصر یہ کہ میں پہلے پھیرے گھر آئی تو میں نے امّی سے کہہ دیا کہ میرے ٹکڑے کر دو، سُسرال نہیں جاؤں گی۔ آباجان پریشان ہوئے۔ میں نے انہیں ساری بات کہہ سنائی۔ بھائیوں نے میرا ساتھ دیا۔ آباجان کی روشن خیالی بیدار ہو گئی اور مجھے کچھ شہ مل گئی۔ اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ دُولہا میاں مجھے لینے آئے تو میں باہر گئی ہوئی تھی۔ حمیدہ سے ملاقات ہوئی۔ اُس نے خوشی کا اظہار کیا لیکن اس خوشی میں دکھ کا رنگ زیادہ تھا۔

ہم دونوں کام میں مصروف ہو گئے۔ اُس روز بہت سی لڑکیاں الیکشن کے

سلسلے میں جمع تھیں۔ اچانک میرا دولہا آگیا اور اشارے سے مجھے باہر بلایا۔ کہنے لگا "میں نے تمہیں جس کام سے روکا تھا تم نے وہی کام کیا۔ میں جا رہا ہوں۔ اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو ابھی چلو اور یہ کام ہمیشہ کے لیے دماغ سے نکال دو۔"

میں نے جواب دیا ——— "پھر بہتر یہ ہے کہ آپ میرے بغیر چلے جائیں۔"

وہ غصے سے پھنکارتا چلا گیا۔

میں گھر آئی تو امّی رو رہی تھیں اور اباجان خاموش بیٹھے تھے۔ امّی کے منہ میں جو آیا انہوں نے کہہ ڈالا۔ اباجان مجھے کمرے میں لے گئے اور تحمّل سے پوچھا کہ خاوند کے ساتھ میری کیا باتیں ہوئی ہیں۔ میں نے انہیں اس کی پہلی ملاقات یعنی شبِ عروسی کی باتیں سنا دیں اور اب وہ پارٹی کے دفتر میں مجھے جو کہہ آیا تھا وہ بھی بتا دیا۔

اباجان کی بھی کچھ سوشل حیثیت تھی ان کی غیرت کی رگ پھڑک اُٹھی۔ مجھ سے پوچھا ——— "اگر میں ان لوگوں کے خلاف ڈٹ جاؤں تو تمہیں اعتراض تو نہ ہو گا؟"

میں ان کی زبان سے یہی الفاظ سننا چاہتی تھی۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے اعتراض نہیں خوشی ہو گی۔ یہ لوگ ہمیں اپنا اس حد تک غلام بنانا چاہتے ہیں کہ ہمارے دین اور ایمان کو بھی اپنے رنگ میں مسخ کر دینا چاہتے ہیں۔ اباجان نے بتایا کہ میرا خاوند انہیں دھمکی دے گیا ہے کہ لڑکی سٹوڈنٹ فیڈریشن سے الگ نہ ہوئی تو اسے طلاق دے دی جائے گی۔

اُس وقت میں سمجھتی تھی کہ یہ سلوک صرف میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ اباجان نے بتایا کہ چند اور گھروں میں بھی ایسے واقعات ہو چکے ہیں کہ سیاسی اختلاف پر طلاقیں ہو گئی ہیں۔ مجھے یہ سُن کر بہت افسوس ہوا کہ قوم میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو انگریزی حکومت کے علاوہ کانگرس کا پیسہ کھا کر تحریکِ پاکستان کو تباہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مطالبہ پاکستان کی

مخالفت صرف غیر مسلم نہیں کر رہے تھے ، بلکہ ہماری اپنی قوم میں ہمارے دشمن موجود تھے ۔

یہ آپ بیتی آگے چلانے سے پہلے میں اپنا ایک مشاہدہ پیش کرنا چاہتی ہوں ۔ ایک یہ کہ ہماری اپنی صفوں میں ہمارے جو مخالفین تھے ، انہیں میں نے پاکستان میں آکر اُس صف میں دیکھا ہے اور دیکھ رہی ہوں ۔ جو صف اپنے آپ کو پاکستان کا بانی مبانی کہتی ہے ۔ قائدِ اعظم کو اُس وقت بُرا کہنے والے آج پاکستان میں سیاسی مفاد پرستی کی خاطر ہر بیان اور ہر تقریر میں قائدِ اعظم کے حوالے دیتے ہیں ۔

دوسری بات یہ ہے کہ آج جب کہ قوم میں جنگ آزادی والا جذبہ دب گیا ہے ، میں اپنی آپ بیتی پر غور کرتی ہوں تو کئی باتیں غیر حقیقی نظر آتی ہیں ۔ تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ ایک باپ اپنی اُس بیٹی کو طلاق دلوانے کی باتیں کر رہا تھا جسے اُس نے دو ہی روز پہلے ڈولی میں بٹھایا تھا اور ایک نئی نویلی دلہن اتنے زیادہ دولت مند جاگیرداروں کو ٹھکرا رہی تھی لیکن یہ سب حقیقی ہے ۔ یہ صرف میرے ساتھ نہیں بیتی ۔ ایسے بہت سے کیس ہوئے تھے ۔

اس کے بعد میں سُسرال نہیں گئی ۔ اُدھر سے دھمکیاں بھی آتی رہیں اور صلح صفائی کرانے والے بھی آتے رہے اور وہ لوگ اس قسم کی بہتان تراشی بھی کرتے رہے کہ لڑکی آوارہ اور بدکار ہے ۔ میرے ابا جان جس محکمے میں تھے وہاں سے انہیں غنڈہ گردی کے خلاف تحفظ مل سکتا تھا ۔ اسی لیے میرے سُسرال نے غنڈہ گردی نہ کی ۔

میں نے حمید کو یہ واردات سنائی تو اُس کے آنسو نکل آئے ۔ کہنے لگا ۔ "آپ کے ہاں شادی ایک کھیل ہے ۔ میرے ہاں شادی کبھی نہ حل ہونے والا مسئلہ ہے ۔"

اُس وقت ٹوانہ وزارت کے خلاف مظاہرے باقاعدہ معرکوں کی صورت

اختیار کر گئے تھے ۔ ہم الیکشن جیت چکے تھے ۔ انگریز نے تسلیم کر لیا تھا کہ مسلمان ایک الگ تھلگ قوم ہے اور یہ قوم منظم ہو کر ایک محاذ پر معرکہ آرا ہو چکی ہے ۔ یہ کامیابی پاکستان کا بنیادی پتھر تھی لیکن پنجاب میں ہم پر ظلم و تشدد بڑھ گیا ۔ حمید مجھے کئی روز نظر نہ آیا ۔ وہ صفِ اوّل کا مجاہد تھا ۔ مظاہرہ پُر امن ہو یا ہنگامہ خیز، حمید قائدین کی صف میں یا ہراول میں ہوتا تھا ۔

ایک روز پتہ چلا کہ حمید لاپتہ ہے ۔ اس کے متعلق مختلف خبریں سنیں ۔ اس کا کہیں سراغ نہ ملا ۔ یہ قربانیاں رائیگاں نہ گئیں ۔ ٹوانہ وزارت مستعفی ہوگئی ۔

پھر ۳ جون ۱۹۴۷ء کی شام برِصغیر کی تقسیم کا اعلان ہوگیا ۔ قوم نے میدان مار لیا ۔ خدائے ذوالجلال نے وہ دن بھی دکھایا جب ہم نے آزاد قوم کی حیثیت سے اپنے پرچم کو سلامی دی ۔ اس کے ساتھ ہی مہاجرین کا سیلاب آیا ۔ طلباء اور طالبات ان کے استقبال اور دیکھ بھال میں مصروف ہوگئیں اور کسی مسئلے کا اِرد گرد و پیش کا ہوش نہ رہا ۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا ۔ میرے گھر کا مسئلہ یہ تھا کہ میرا خاوند مجھے طلاق نہیں دے رہا تھا ۔ میں دوسری شادی نہیں کر سکتی تھی ۔ چپقلش اتنی بڑھ گئی تھی کہ سمجھوتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ۔ میرے ابا جان کوئی قانونی کارروائی نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ ایسے کیس سول کورٹ میں جاتے ہیں جہاں فیصلہ ہونے تک انسان بوڑھا ہو چکا ہوتا ہے ۔ ابا جان نے ضلعے کے پہلے مسلمان ڈپٹی کمشنر سے بات کی ۔ یہ میرے لیے عجیب تھا کہ ڈپٹی کمشنر مسلمان بھی ہو سکتا ہے ۔ یہ مسلمان ڈی سی پاکستان کا شیدائی تھا اور پکا مسلمان ۔ پاکستان نیا نیا بنا تھا ۔ قائدِ اعظم زندہ تھے اور جذبے تر و تازہ تھے ۔

ڈپٹی کمشنر نے میرے سُسر ، میرے خاوند ، میرے ابا جان کو اور مجھے اپنے دفتر بلایا ۔ ابا جان اُسے ساری بات سُنا چکے تھے ۔ ہم سب کا آمنا سامنا ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ہوا ۔ اُس نے میرے خاوند اور سُسر کو بہت ہی ذلیل کیا میرے

خاوند نے کہا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔

ڈپٹی کمشنر نے مجھ سے پوچھا ــــــ "بیٹی! تم کیا چاہتی ہو؟"

میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا ــــــ "طلاق۔ میں ان لوگوں کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی"۔

ڈپٹی کمشنر نے ایک کاغذ اور اپنا قلم میرے خاوند کے آگے رکھ کر کہا ــــــ "طلاق لکھو اور حق مہر کی آدھی رقم ادا کرو"۔

خاوند نے برخورداری سے طلاق نامہ لکھ دیا۔ میرے سُسر نے خفت مٹانے کے لیے مجھے یاد نہیں کیا کہا۔ ڈپٹی کمشنر نے گرج کر کمرہ ہلا دیا۔ اُس نے کہا ــــــ "نکل جاؤ یہاں سے میر جعفرو! تمہارے آقا یہاں سے چلے گئے ہیں۔ ہتھکڑیاں لگا کر جیل بھجوا دوں گا" ــــــ ڈپٹی کمشنر کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ میرے آنسو بہہ نکلے اور میں اسی کیفیت میں وہاں سے نکل آئی۔

آج قوم اس قسم کے ڈپٹی کمشنروں کو ڈھونڈھ رہی ہے۔ یہ دراصل دھونس تھی۔ ڈپٹی کمشنر کو معلوم تھا کہ قانونی چارہ جوئی بڑا ہی طویل اور صبر آزما طریقہ ہے۔ اُس نے ذرا سی دیر میں میرا مسئلہ حل کر دیا۔ دوسرے دن میرے سسرال سے پانچ ہزار روپیہ آ گیا۔

قوم چونکہ جہاد سے فارغ ہو چکی تھی اور نئی سرگرمیاں ڈھونڈھ رہی تھی، اس لیے میرے جاننے والوں نے یہ سرگرمی اختیار کر لی کہ مجھے موضوعِ سخن بنا لیا اور یہ مشہور کر دیا کہ اس لڑکی کو آوارگی کے جرم میں طلاق ملی ہے۔ ملک کی چار دیواری مکمل کر کے قوم اپنی چار دیواری کے اصل رنگ میں واپس آ گئی۔ جہاں میرے رشتے کی بات ہوتی وہاں یہ مسئلہ کھڑا کر دیا جاتا کہ لڑکی مطلقہ ہے، لہٰذا ثابت کیا جائے کہ لڑکی بدچلن نہیں۔ کبھی کبھی تو میں جل بھُن جاتی اور بھائیوں سے کہتی کہ ہمیں جہادِ آزادی کا یہ صلہ ملنا تھا؟ ایسی حالت میں مجھے بھائی سنبھال لیا کرتے تھے۔ امّی کی جذباتی حالت بہت بُری تھی۔ بہت کوشش کے باوجود اُن کی

ذہنی حالت بگڑتی گئی۔

دو سال بعد میری دوسری شادی ہو گئی۔ گھرانہ اچھا تھا اور خاوند بھی اچھا مل گیا۔ پہلی رات اُس کے پوچھنے پر میں نے اُسے پہلی شادی کی ساری واردات کہہ سنائی۔ اُس نے اس کے جواب میں مجھے اسی قسم کی تین کہانیاں سنا دیں۔ وہ ۱۹۴۶ء میں دِلّی میں تھا جہاں اُس نے تحریکِ پاکستان میں اُسی جوش و خروش سے کام کیا تھا جس طرح ہم نے کیا تھا۔

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری ازدواجی زندگی بہت اچھی ثابت ہوئی۔

وقت اچھا گزرتا گیا۔ میرے گھر میں بچوں کی رونق آتی گئی مگر پاکستان کی رونق اُجڑتی گئی۔ اُس پاکستان کا تصوّر ہی گڈمڈ ہوتا گیا جس کی خاطر ہم نے جنگِ آزادی لڑی تھی اور ایک روز تو میرے آنسو نکل آئے۔ یہ ۱۹۶۴ء کا ذکر ہے۔ ایوّب خان کا دورِ حکومت تھا۔ میں نے اخبار میں ایک تصویر دیکھی۔ ایوّب خان دیہاتی علاقے کے دَورے پر کسی ٹیوب ویل کا یا ٹیوب ویلوں کی سکیم کا افتتاح کرنے گیا تھا۔ تصویر میں میرا پہلا خاوند ایوّب خان کے شانہ بشانہ کھڑا تھا۔ تصویر کے نیچے اُس کا نام لکھّا تھا اور نام کے ساتھ اس کا بہت بڑا معاشرتی رتبہ لکھا تھا جو مجھے یاد نہیں رہا کہ کیا تھا۔ پاکستان کی مخالفت کرنے والا انسان اور اس کا خاندان اب پاکستان کے بادشاہ کا منظورِ نظر اور "معزّز" فرد تھا۔ ایوّب خان کا دَور ختم ہوا تو یہ انسان اور اس کا خاندان ایوّب کے مخالفین کا منظورِ نظر اور "معزّز" فرد بن گیا۔

پچھلے سال انہی دنوں کا واقعہ ہے۔ میں اپنے میکے گئی۔ عورت ضعیف ہو جائے تو بھی اُس کے دل میں اپنے میکے کی محبّت ماند نہیں پڑتی۔ یہی حالت میری رہتی ہے۔ وہاں اب اباجان نہیں، امّی نہیں۔ دو بھائی اپنے بیوی بچّوں کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ گھر خاصا کشادہ ہے۔ انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ میں گھر گئی تو کمروں کا سامان صحن اور برآمدوں میں بکھرا ہُوا تھا۔ ہر

طرف سفیدی کے چھینٹے تھے۔ میری بھابیاں اکتائی ہوئی تھیں۔ کہنے لگیں کہ پندرہ روز ہوگئے ہیں یہاں سفیدی ہو رہی ہے۔ میرے بھائیوں نے صرف ایک آدمی کو لگا رکھا ہے جس کے ساتھ ایک مزدور ہے۔ بھائیوں سے کئی بار کہا گیا کہ ایک اور آدمی بلا لو اور کام ختم کراؤ لیکن دونوں کہتے ہیں کہ یہی ایک آدمی کام کرے گا۔ اسے دونوں وقت روٹی بھی کھلاتے ہیں اور پیسے الگ دیتے ہیں۔ سفیدی کرنے والا بوڑھا بھی ہے اور اس کا ایک ہاتھ بیکار بھی ہے۔

مجھے طیش آیا۔ دونو بھائی دفتر گئے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ میں چند دنوں کی تفریح کے لیے آئی ہوں اور یہاں گھر کا یہ حال ہے۔ سفیدی والا کمرے میں لگا ہوا تھا۔ میں برآمدے میں گئی اور مزدور سے کہا کہ اُسے باہر بھیجو۔ میں اُسے کہنا چاہتی تھی کہ کل سے دو اور سفیدی کرنے والے اپنے ساتھ لاؤ اور دو روز میں کام ختم کرو۔

مزدور اُسے باہر بُلا لایا۔ میں نے اُسے ایک نظر میں اُوپر سے نیچے تک دیکھ لیا۔ اُس کے سر اور چہرے پر چونے کے چھینٹے تھے۔ وہ خاصا بوڑھا تھا۔ بال سفید ہو چکے تھے۔ اُس کا بایاں بازو مُڑا ہوا اور اس ہاتھ کی تین انگلیاں اندر کو مڑی ہوئی تھیں۔

"بڑے میاں تم سفیدی جلدی نہیں کر سکو گے" ــــ میں نے اُسے کہا۔

اُس نے اپنا بایاں بازو میرے آگے کرکے کہا ــــ "آدھا آدمی ہوں۔ ان لوگوں نے کرم کیا ہے اور میرا روزگار لگا دیا ہے۔ اگر آپ چاہتی ہیں ....."

وہ فوراً چُپ ہو گیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے سر سے پاؤں تک پھر پاؤں سے سر تک دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں سے میرا نام سرگوشی کی طرح نکلا اور اس کے ساتھ ہی اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے پوچھا ــــ "آپ کب آئی ہیں؟ مجھے یاد نہیں رہا تھا یہ گھر آپ کا ہے۔ کتنے سال گزر گئے ہیں؟"۔

اُس نے سوچ کر کہا ــــ "اٹھائیس"۔

میرے منہ سے چیخ کی طرح نکلا ــــ "حمید؟ ..... نہیں۔ تم حمید

نہیں ہو سکتے"۔

"کیوں؟" ــــ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ــــ "میں حمید کیوں نہیں ہو سکتا؟ جہاں ساری قوم کا حلیہ بگڑ سکتا ہے وہاں اکیلے حمید کو اس حلیے میں دیکھ کر آپ کیوں حیران ہوئی ہیں"؟

وہ حمید تھا۔ سٹوڈنٹ فیڈریشن اور تحریکِ پاکستان کا جانباز اور سرفروش مجاہد وقت سے بہت پہلے بوڑھا ہو گیا تھا۔ وہ تو میرا ہم عمر تھا۔ اس کے ساتھ جو بیتی تھی وہ اختصار سے یوں ہے کہ ٹوانہ وزارت کے خلاف مظاہروں کے آخری دنوں میں حمید لاپتہ ہو گیا تھا۔ اب پچھلے سال اس حال میں اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ جلوس پر لاٹھی چارج ہوا تو وہ بھاگنے کی بجائے آگے چلا گیا۔ اس کے ساتھ چند اور نوجوان بھی تھے جو اس لیے آگے گئے تھے کہ آگے سکولوں کے بچے تھے۔ انہیں پولیس کی لاٹھیوں سے بچانا تھا۔

حمید نے تیرہ چودہ سال کی عمر کے ایک بچے کو دیکھا۔ وہ گر پڑا تھا اور ایک پولیس کانسٹیبل نے اُسے مارنے کے لیے لاٹھی اُوپر کر لی تھی۔ حمید نے پیچھے سے لاٹھی پکڑ کر کھینچی تو کانسٹیبل پیچھے کو گرا اور لاٹھی حمید کے ہاتھ میں آ گئی۔ کسی نے بچے کو اُٹھا لیا۔ حمید نے غصے میں آ کر لاٹھی کانسٹیبل کے سینے پر ماری اور اُس کی تین چار پسلیاں توڑ دیں۔ معاً دائیں بائیں سے حمید کے سر اور بازوؤں پر جانے کتنی ہی لاٹھیاں پڑیں۔ دو روٹیوں اور ایک پیاز پر زندہ رہنے والا نوجوان بے ہوش ہو گیا۔ ہوش میں آیا تو وہ کسی تھانے میں تھا جہاں اسے بڑی ہی بھیانک اذیتیں دی گئیں۔ ان سے اس کا دماغ بگڑ گیا۔

اسے کچھ یاد نہیں کہ جس پاکستان کے حصول کے لیے وہ جسمانی اور ذہنی لحاظ سے مفلوج ہو گیا تھا، وہ کب معرضِ وجود میں آیا۔ کس طرح آیا اور کیا ہوا۔ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد جیل خانوں سے تمام سیاسی ورکر رہا ہو چکے تھے لیکن حمید کو پاگل قرار دے کر رہا نہ کیا گیا۔

وہ جب باہر آیا تو پاکستان کی عمر تین سال ہو چکی تھی۔ دماغ صحیح نہیں تھا لیکن

کبھی کبھی وہ اپنے آپ میں آجاتا تھا۔ وہ گھر تک پہنچ گیا جہاں دنیا ہی بدل گئی تھی۔
گھر میں صرف دو بہنیں تھیں۔ باپ بھی مرچکا تھا، ماں بھی۔ ظاہر ہے کہ وہ بیٹے
کے غم میں قبل از وقت مرگئے تھے۔ بہنیں دوسروں کے گھروں میں کام کرتی تھیں۔
حمید کے دماغ کو یہ صدمہ لے بیٹھا۔ دماغ جو ذرا سا صحیح ہوا تھا بالکل ہی بگڑ گیا۔
تقریباً ایک سال پاگل پن کی کیفیت میں رہا۔

اتفاق سے اُسے گجرات کا ایک لڑکا مل گیا۔ اس لڑکے نے اسے بڑھی ہوئی
داڑھی اور بگڑے ہوئے حلیے کے باوجود پہچان لیا۔ یہ سٹوڈنٹ فیڈریشن کا لڑکا تھا۔
کالج سے فارغ ہوچکا تھا۔ اس کا کوئی عزیز ڈاکٹر تھا۔ وہ حمید کو اس ڈاکٹر کے
پاس لے گیا اور اس کا سارا پس منظر بتایا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اس کا بازو مستقل طور پر
بیکار ہوچکا ہے۔ بازو کی کوئی اہم رگ ماری گئی تھی جس سے بازو اور انگلیاں ٹیڑھی
ہوکر بیکار ہوگئی تھیں۔ دماغ کے متعلق ڈاکٹر نے کہا کہ وہ ٹھیک کردے گا چنانچہ
ڈاکٹر نے اس کا مفت علاج کیا۔ طاقت کے انجکشن بھی دیئے اور چھ مہینوں
میں اسے ٹھیک کردیا مگر اس وقت تک وہ حمید اجھلّا کے نام سے مشہور ہوچکا تھا۔
گجرات کے اس لڑکے نے اسے مالی مدد پیش کی جو حمید نے قبول نہیں کی۔
اس نے ہوش میں آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ مکان بیچ کر دونوں بہنوں کی شادی
اس پاکستان میں منہ مانگے جہیز کے ساتھ کردی جس کے متعلق اُس نے خواب دیکھا
تھا کہ یہاں شریعت کے اصولوں کی حکمرانی ہوگی اور نادار بھائی اپنی بہنوں کو
جہیز کے بغیر بیاہ سکیں گے۔

بہنوئیوں نے اسے اپنے ساتھ رکھنے کی پیش کش کی جو اُس نے قبول نہیں
کی۔ وہ خوش تھا کہ اس نے بہنوں کو بیاہ کر اپنے ماں باپ کی روحوں سے بوجھ
اتار دیا ہے۔ پانچ روپے ماہوار کرائے پر وہ ایک جھگی میں رہنے لگا۔ اسے بازو

کی معذوری کی وجہ سے کہیں بھی نوکری نہ ملی۔ اسے جاننے پہچاننے والے اسے
بچوں کی ٹیوشن بھی نہیں دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ جھلّا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس
کا دماغی نقص پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ میرے ساتھ اچھی بھلی باتیں کرتے
کرتے وہ ذرا سی دیر کے لیے بہک جاتا اور پھر سنبھل جاتا تھا۔

آخر اس نے مزدوری شروع کردی جہاں کہیں دو روٹیوں اور ایک پیاز کے
لیے کوئی بھی کام ملا اُس نے کرلیا۔ پھر سفیدی کا کام شروع کردیا۔ یہ بھی اسے کم
ہی ملتا تھا کیونکہ ایک بازو سے وہ تیزی سے کام نہیں کرسکتا تھا۔ گذشتہ سال
میرے بھائیوں نے اسے دیکھ لیا۔ انہیں حمید نے پہچانا تھا۔ وہ اسے ساتھ لے
آئے اور کہا کہ خواہ تین مہینے لگ جائیں اس گھر کی سفیدی وہی کرے گا۔

اُس نے مجھے کہا ـــــ "آپ کے بھائیوں نے میرا ایک اصول توڑ دیا ہے۔
مجھے زبردستی دو وقت کی روٹی یہیں کھلاتے ہیں۔ میں دو روٹیوں اور ایک پیاز
کا عادی ہوں۔ آپ انہیں کہیں میری عادت نہ توڑیں" ـــــ اُس نے میرا ہاتھ
پکڑ لیا اور کہا ـــــ "آپ رو رہی ہیں۔ آپ ہنستی کیوں نہیں؟ میرا حوصلہ
بڑھاتی کیوں نہیں؟"

میں نے چونے سے لتھڑا ہوا اُس کا بایاں ہاتھ جو اُس نے پاکستان کے
نام پہ قربان کردیا تھا، دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر دیوانہ وار چوما۔ میں اور کیا کرسکتی
تھی؟ کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔ میں نے اسے کہا کہ وہ میرے ساتھ چلے اور باقی
عمر کام کے بغیر آرام اور سکون سے گزارے، مگر اُس نے جن الفاظ میں اور جس
لہجے میں میری پیش کش ٹھکرائی میں جرأت نہ کرسکی کہ اصرار کروں۔

"میں اپنے فرائض ادا کرچکا ہوں" اس نے کہا "قوم نے ایک فرض سونپا
تھا، ادا کردیا ہے۔ ماں باپ ایک فرض سونپ گئے تھے، ادا کردیا ہے۔ اگر
خدا نے مجھے زندہ رہنے کا فرض سونپا ہے تو دو روٹیوں اور ایک پیاز پہ زندہ
رہ کر یہ فرض بھی وقار سے ادا کر رہا ہوں۔"

میں نے بھائیوں سے کہا کہ اسی کو کام کرنے دو۔

بلینا کا دھرم، میری بہنوں کی عصمت

جب سے "حکایت" میں مجاہدِ اعظم صلاح الدّین ایوّبی کی داستانِ جہاد شائع ہو رہی ہے میں اسے پوری دل چسپی سے پڑھ رہا ہوں۔ اسلام کے اس عظیم مجاہد کی اس پیشین گوئی کو میں نے اپنے دور میں پورا ہوتے دیکھا ہے کہ کفار مسلمانوں کو عورت کے ہاتھوں شکست دیں گے اور مسلمان عورت کے قیدی بن کر سلطنتِ اسلامیہ کو ختم کر دیں گے۔ میں نے جب "داستان ایمان فروشوں کی" کے سلسلے کی پہلی کہانی پڑھی تھی اسی وقت میرا ضمیر مجھے مجبور کرنے لگا تھا کہ میں اپنی وہ آپ بیتی سب کو سنا دوں جو میں ۱۹۴۶ء سے اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہوں۔ سنانے سے اس لیے ڈرتا رہا کہ یہ آپ بیتی نہیں اقبالِ جرم ہے۔ آج اس لیے سنانے کی ہمّت کی ہے کہ قوم عورت کے تصوّر میں گم ہوتی جا رہی ہے۔ یہ عورت ہمیں سینما سکرین پر دکھائی جاتی ہے، ٹی وی پہ دکھائی جاتی ہے۔ اخباروں، رسالوں اور ناولوں میں تو عورت کو بالکل ہی ننگا کر کے قوم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا خطرناک پہلو یہ ہے کہ پاکستان کے لوگ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ یہ بے حیائی ہمارے دشمن ہمارے ذہنوں میں داخل کر رہے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں سے ایمان اور قومی کردار نکال لیا جائے۔

مجھے شک ہے کہ میرے پاکستانی بہن بھائی اور بچے جو ذہنی عیاشی کے عادی ہوگئے ہیں، صلاح الدین ایوبی کی کہانیوں کو افسانے سمجھتے ہوں گے۔
میں انہیں اپنی آپ بیتی سُنا دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہی تجربہ بہت سے مسلمانوں کو ہوا ہوگا لیکن وہ میری طرح اقبالِ جرم کی جرأت نہیں کریں گے۔
اس وقت ضرورت یہ ہے کہ نوجوانوں کو وعظ سنانے کی بجائے اپنے اُس وقت کے اچھے اور بُرے تجربات سنائے جائیں جب ہم نوجوان ہوا کرتے تھے۔

میری آپ بیتی کا آغاز اور انجام مشرقی پنجاب (بھارت) کے ایک قصبے میں ہوا تھا۔ میں نے دس جماعتیں پاس کرلی تھیں۔ والد صاحب مرحوم کی خواہش تھی کہ ایم۔اے نہیں تو بی۔اے کی ڈگری ضرور لوں مگر ان کی خواہش میری طبیعت کے خلاف تھی۔ میں کھیل کود کا عادی ہوگیا تھا۔ یہ تو باپ کی عزت کا خیال تھا کہ میں نے سیکنڈ ڈویژن کے نمبر لے کر میٹرک کا سرٹیفکیٹ لے لیا تھا۔
مجھے نوکری کی تو ضرورت ہی نہیں تھی۔ آبائی اراضی اتنی زیادہ تھی کہ مزارعوں اور کاشت کاری کے دیگر معاملات کی نگرانی کے لیے گھر کے کسی فرد کی ہر وقت ضرورت تھی۔ والد صاحب بھاگتے دوڑتے رہتے تھے۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ انہیں اُدھر سے فارغ کردوں گا۔ انہوں نے مجھے قریب کے ایک شہر کے کالج میں داخل کرا دیا۔ میرا دل تعلیم میں تو نہ لگا، میرے پَر کُھل گئے اور میں دُوسرے مشاغل میں مگن ہوگیا۔ میں جب بارھویں میں دو دفعہ فیل ہوا تو والد صاحب نے سنجیدگی سے پوچھا کہ میرا ارادہ کیا ہے۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ میں گھر رہ کر زمینوں کی دیکھ بھال کرنا چاہتا ہوں۔
وہ مان گئے۔

میں اپنے متعلق آپ کو کچھ اور بھی بتا دوں تو میری آپ بیتی سمجھنے میں آپ کو سہولت ہوگی۔ میں ماں باپ کا اکیلا بیٹا تھا۔ دو بہنیں تھیں۔ والد صاحب اچھی حیثیت کے زمیندار تھے اس لیے برادری پر اُن کا حکم چلتا تھا۔

میں بچپن سے کھلنڈرا اور لڑاکا تھا۔ لیکن ایسا لڑاکا نہیں کہ بلاوجہ ہر کسی کے گلے پڑتا رہتا۔ ضرورت پڑتی تو میں چھوٹے بڑے کا لحاظ نہیں کرتا تھا۔ اس سے میری دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ میں جذبے والا پکا مسلمان نہیں تھا۔ ہمارے قصبے میں مسلمانوں کی آبادی تیس فیصد تھی۔ باقی سب ہندو اور سکھ تھے۔ یہ لوگ مسلمانوں کو اپنے ماتحت رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اگر کوئی ایسا موقعہ آجائے جہاں ہندوؤں، سکھوں سے ٹکراؤ کا امکان ہو وہاں میں پکا مسلمان بن جایا کرتا تھا۔ اُس وقت میں تمام ہم عمر مسلمان لڑکوں کا لیڈر ہوتا تھا۔
والد صاحب مرحوم میری اس لیڈری اور اپنا سر اونچا رکھنے کی عادت کو بہت پسند کرتے تھے۔ دسویں جماعت پاس کرنے تک میں اچھا خاصا لٹھ باز، دلیر اور لیڈر بن چکا تھا۔ کبھی کبھی میں غنڈہ گردی پر بھی اُتر آتا تھا۔ خدا نے جسم بھی گٹھا ہوا دیا تھا۔ شکل بھی اچھی تھی۔ رنگ رُوپ بھی اچھا تھا اور زبان میں ایسی طاقت آگئی تھی کہ میں بعض بڑوں کو بھی اپنی رائے اور اپنی بات کا قائل کر لیا کرتا تھا۔
مجھے جب شہر کی ہوا لگی تو میں آوارہ تو نہیں ہوا، دماغ کچھ اور کھل گیا۔ اس سے میں زیادہ دلیر ہوگیا۔ ہندوؤں سکھوں کے اصل عزائم سے بھی واقفیت ہوگئی۔
ایک بار کالج میں ایک ہندو لڑکے نے مجھے کہا ——— "تم نماز نہیں پڑھتے، روزے نہیں رکھتے لیکن اسلام کے خلاف ذرا سی بات بھی برداشت نہیں کرتے"۔
میں نے اُسے جواب دیا تھا ——— "میں ہندو کا نہیں مسلمان کا بیٹا ہوں"۔
میرا اسلام اتنا سا ہی تھا کہ میں مسلمان کا بیٹا تھا اور میں اسلام کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرسکتا تھا خواہ مجھے یہ بات سمجھ ہی نہ آئے۔
میں جب کالج کے دوسرے سال میں تھا تو گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر آیا۔

ایک روز ظہر کے وقت باہر شور شرابہ سنائی دیا۔ باہر گیا تو معلوم ہوا کہ ایک مسجد کے سامنے سے ہندو ڈھول باجے بجاتے گزر رہے ہیں۔ اذان ہو رہی تھی۔ مسجد میں سے ایک مسلمان نے بارات والوں سے کہا کہ وہ بینڈ باجا بند کریں۔ ہندو نہیں مانے۔ مسلمانوں نے بارات روک لی۔ ہندو مسلمانوں کے ساتھ جنگ و جدل کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ مسلمان اکٹھے ہو گئے۔ ہندو بھی لڑائی کے لیے تیار ہو گئے۔

مَیں نے محلّے برادری کے نوجوانوں کو فوراً بلا لیا۔ کسی نے لاٹھی اٹھائی، کسی نے کلہاڑی اٹھائی۔ ہم موقعۂ واردات کی طرف دَوڑ پڑے۔ راستے میں اپنے دوستوں کو پکارتے اور ساتھ ملاتے گئے۔ مسجد والے محلّے میں پہنچے تو ایک طرف مسلمانوں کا اور دوسری طرف ہندوؤں اور سکھّوں کا ہجوم تھا۔ دونوں طرف کے دو چار بزرگ درمیان میں کھڑے صلح صفائی کرا رہے تھے۔ مسلمان شاید اقلیّت میں ہونے کی وجہ سے ذرا دبک رہے تھے۔

میرے ساتھ پندرہ بیس لڑکے تھے۔ مَیں بزرگوں کے درمیان جا رُکا۔ مجھے اچھی طرح پتہ نہیں تھا کہ وہاں کیا ہو رہا تھا اور مصالحت ہوئی تھی یا نہیں۔ معلوم نہیں یہ مسلمانی کا جوش تھا یا جوانی کا، مَیں نے ہندوؤں کے ہجوم کو بہت ہی بیہودہ اور اشتعال انگیز الفاظ میں للکارا۔ میرے دوست ہتھیار بلند کر کے اور نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھے۔ یہ میرا جانباز دستہ تھا جو آگے بڑھا تو ہندوؤں کا ہجوم اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگا۔

مَیں نے للکار کر کہا —————— "تین چار کافروں کو کاٹ دو۔ سب کا دماغ درست ہو جائے گا۔"

ہندو نوجوان مجھے جانتے تھے۔ وہ میرا اور میرے دوستوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے اپنی قوم کے ہجوم میں غائب ہو گئے۔ میری للکار پر تمام مسلمان ہندوؤں کی طرف دوڑے۔ مَیں نے سب کو بھڑکا دیا تھا۔

ہم چونکہ ہندوؤں کے درمیان پیدا ہوئے اور انہیں اچھی طرح جانتے ہیں، اس لیے وہ پاکستانی جو پاکستان میں پیدا ہوئے ہیں نہیں جانتے کہ ہندو اصل میں کیا ہے۔ ہندو تاریخی بزدل قوم ہے اور یہ قوم مسلمان کے خون کی پیاسی ہے۔ یہ پیاس بجھانے کے لیے ہندو ایک ایک کی صورت میں ایک ایک مُسلمان کے سامنے نہیں آتا بلکہ ہجوم کی صورت میں اکیلے مسلمان پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ دُودھ پیتے مسلمان بچے کو قتل کر کے اور مجبور اور بے بس مسلمان خواتین کی بے حرمتی کر کے خوش ہوتا ہے۔

ہندو کا دوسرا طریقہ وہی ہے جو شیوا مرہٹہ نے افضل خان کو شہید کرنے کے لیے استعمال کیا تھا یعنی دوستی کا جھانسہ دے کر بغل گیر ہونا اور پیٹھ میں چُھرا گھونپ دینا۔ صلاح الدّین ایوّبی کے یہ الفاظ سو فیصد سچ ہیں کہ ہم عصمتوں کے محافظ ہیں اور صلیبی عصمتوں کے بیوپاری۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں ہندوؤں نے انگریزوں کو خوش اور مسلمانوں کے خلاف کرنے کے لیے اپنی بیٹیاں استعمال کی تھیں۔ ہم عصمت کے پیچھے مر مٹتے تھے اور ہندو اپنی لڑکیوں کی عصمت کو ہتھیار اور حربے کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔

میرے پندرہ بیس دوست جوش میں گالیاں دیتے اور نعرے لگاتے ہندوؤں کی طرف دوڑے تو ہندوؤں نے اپنی تاریخی بزدلی کا مظاہرہ کیا۔ ہم اُن تک پہنچ نہ سکے کیونکہ دونوں طرف کے بوڑھے ہمارے راستے میں آ گئے اور پولیس کی پُوری گارد آ گئی۔ تھانیدار ہندو تھا۔ اُسے دیکھ کر ہندو آگے آ گئے اور انہوں نے اتنا واویلا بپا کیا کہ آسمان سر پر اُٹھا لیا۔

مسلمان منتشر ہو گئے۔ مجھے بھی انہوں نے بھاگ جانے کو کہا، کیونکہ میری گرفتاری لازمی تھی۔ ہندوؤں کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ مجھے گرفتار کیا جائے لیکن تھانیدار نے کوئی کارروائی نہ کی۔ دونوں فریقوں کو دوستی اور دھمکی سے سمجھایا۔ مَیں پھر بھی ہندوؤں کو للکارتا رہا۔ میرے جانبازوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ وہ میرے

ساتھ رہے ۔ مَیں نے آخر میں کہا کہ آیندہ کسی ہندو یا سکھ کی بارات کسی مسجد کے آگے سے باجے بجاتے نہیں گزرے گی ۔

تھانیدار نے مجھے گرفتاری کی دھمکی بھی دی اور کہا کہ تم ان بے سمجھ اور جوشیلے لڑکوں کے لیڈر بنے ہوئے ہو ۔ ان سب کے جرم کی سزا صرف تمہیں ملے گی ۔

دنگا فساد ہوتے ہوتے رہ گیا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ فساد کی جڑ بھی اکھڑ گئی تھی ۔ میرے بزرگوں نے مجھے بتایا تھا کہ ہندو کسی اور طریقے سے جوابی حملہ کریں گے ۔ مجھے یہ بھی پتہ چل گیا کہ ہندوؤں نے میرے متعلق یہ رائے قائم کر لی تھی کہ مَیں لٹھ باز اور لیڈر ہوں ۔ اس کے بعد مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ہندوؤں کو موقع ملا تو وہ سب سے پہلے مجھے قتل کریں گے ۔

مَیں محتاط اور ہوشیار ہونے کی بجائے موقع بے موقع ہندوؤں کو للکارنے لگا اور تین چار موقعے آئے کہ میں نے اُن ہندو جوانوں کو جو اپنے آپ کو اپنے نوجوانوں کا لیڈر سمجھتے تھے مارا پیٹا ۔ ہر بار نوبت ہندو مسلم فساد تک پہنچی لیکن فساد نہ ہوا ۔ میری دھاک بیٹھ گئی ۔

فساد کا ایک موقع اور بھی آیا ۔ ہمارا قبرستان شہر کے ساتھ تھا جس کے دو طرف ہندوؤں اور سکھوں کے محلے تھے ۔ ایک روز کسی ہندو کی گائے قبرستان میں چلی گئی ۔ قبرستان کے ملنگ مسلمان تھے ۔ انہوں نے گائے کو اتنا مارا کہ ایک جگہ سے اس کا خون نکل آیا ۔ ہندو گائے کو دیوی سمجھتے اور اس کی پوجا کرتے ہیں ۔ ہندوؤں نے اپنی گائے کا خون دیکھا تو سارے قصبے میں بات پھیل گئی ۔ ہندو تیار ہو کر آ گئے ۔

ہمیں خبر ملی تو ہم لاٹھیاں اور کلہاڑیاں وغیرہ اٹھائے قبرستان میں پہنچ گئے ۔ ہندوؤں کا مطالبہ تھا کہ ہم اُن ملنگوں کو اُن کے حوالے کر دیں جنہوں نے گائے کو مارا ہے ۔ انہیں توقع یہ تھی کہ ملنگ چونکہ چرسی بھنگی ہوتے ہیں اس لیے مسلمان اپنی جان چھڑانے کے لیے انہیں ان کے حوالے کر دیں گے ۔ مسلمان

ایسے گئے گزرے نہیں تھے ۔ مَیں اپنے جانباز دستے کے ساتھ پہنچ گیا ۔ تھوڑی سی لڑائی ہوئی لیکن مسلمان بزرگوں نے معاملہ رفع دفع کرا دیا ۔

ہندوؤں کو اصل دُکھ یہ پہنچ رہا تھا کہ مسلمان اقلیت میں تھے اور وہ ہندوؤں کے مُنہ آتے تھے ۔ ہندو ہمیں اپنے رعب میں رکھنا چاہتے تھے ۔ بعض دُور اندیش مسلمان خون خرابے اور آئے دن کی چپقلش سے بچنے کے لیے ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ دوستی کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے ۔ مَیں جب سیکنڈ ایئر میں دو مرتبہ فیل ہو کر گھر آ گیا تو مَیں نے دوستی کی کوششیں ختم کرا دیں ۔

ہندو کے خلاف ٹکر لینے کے ساتھ ساتھ مَیں مسلمانوں کے خلاف بھی اُٹھ کھڑا ہوتا تھا ۔ عام طور پر برادری میں ہی کسی سے ٹکراؤ ہو جاتا تھا ۔ ہماری زمینیں اکٹھی تھیں علاقہ نہری تھا ۔ کبھی پانی لگانے کی باری پر جھگڑا ہو جاتا اور کبھی کھیتوں کی مینڈھوں کا کوئی تنازعہ کھڑا ہو جاتا ۔ میرے والد صاحب اکیلے تھے ، اس لیے صلح صفائی کر لیا کرتے تھے ۔ مَیں جوان ہو گیا تو صلح صفائی ختم اور لٹھ بازی شروع کر دی ۔ ایسے موقع پر میرے تین چچازاد بھائی میرا ساتھ دیا کرتے تھے ۔ یہی چچازاد تھے جو اس سے پہلے میرے والد صاحب کی حمایت میں کبھی نہیں اُٹھے بلکہ کبھی کبھی مخالفت بھی کرتے تھے ۔ میں نے اُن پر ایسا اثر ڈالا کہ وہ میرے مرید بن گئے ۔ اس کے بعد میں مشہور ہو گیا ۔

۱۹۴۶ کا سال آ گیا ۔ پاکستان کا نعرہ ملک کے ہر ایک گوشے سے سنائی دے رہا تھا ۔ یہ سال ، جیسا کہ آپ نے بعد میں دیکھا تھا ، ہماری آزادی کی جنگ کا فیصلہ کن سال تھا ۔ جو مسلمان اپنے اکثریتی صوبوں میں تھے ، انہیں اتنی زیادہ پریشانیوں کا سامنا نہیں تھا جتنا اُن مسلمانوں کو تھا جو ہندوؤں کے اکثریتی صوبوں اور شہروں وغیرہ میں تھے ۔ وہ آزادی کے جہاد میں پوری طرح شریک تھے لیکن ہندو اور سکھ انہیں سر نہیں اٹھانے دیتے تھے ۔

انگریزوں کا عتاب الگ تھا ۔ اس کے باوجود مسلمانوں نے قلیل تعداد اور

بے شمار مشکلات میں ہی ایسا محاذ بنایا کہ ہندوانہیں دبانے کا کوئی اور طریقہ سوچنے لگے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ پاکستان بن کر ہی رہے گا اور انہوں نے یہ تو دیکھ ہی لیا تھا کہ مسلمان لڑنے والی قوم ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو شکست دینے کے لیے ہندوؤں نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ خانہ جنگی کرانا چاہتے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ہندو نوجوان ایک روز اچانک اکھاڑے کھودنے لگے۔ بعض کو ہم نے کبڈی کھیلتے دیکھا اور پتہ چلا کہ ایک احاطے میں وہ لٹھ بازی اور گتکا سیکھ رہے تھے (گتکا ڈنڈوں سے کھیلا جاتا ہے جو دراصل تیغ زنی کی تربیت اور مشق ہوتی ہے۔

مجھے اُن کی جنگی تیاریوں کے کچھ اور طریقے بھی معلوم ہوئے جن میں ایک یہ تھا کہ ہر ایک ہندو لڑکا بہت سویرے اُٹھتا اور باہر جا کر دوڑ لگاتا تھا۔۔ میں نے مسلمان لڑکوں سے کہا کہ وہ بھی ورزش شروع کر دیں اور گتکے کی مشق بھی شروع کر دیں۔ مسلمانوں میں چند ایک فوجی بھی تھے جو جنگِ عظیم ختم ہو جانے کے بعد فوج سے سبکدوش ہو کر واپس آ گئے تھے۔ انہوں نے ہمیں ٹریننگ دینی شروع کر دی۔ اس میں ہتھیاروں کے بغیر لڑائی کی ٹریننگ بھی شامل تھی۔ یعنی دشمن کے پاس خنجر یا تلوار ہو اور آپ خالی ہاتھ ہوں تو مقابلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ یہ طریقہ ہمارے لیے بالکل نیا اور دلچسپ تھا اور کامیاب بھی۔

مسلمانوں کو تلوار رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ سکھوں کے پاس تلواریں تھیں جنہیں کرپانیں کہتے تھے۔ اسے وہ اپنا مذہبی نشان کہتے تھے اس لیے ہر سکھ کو کرپان اپنے پاس رکھنے کی اجازت تھی۔ ہم کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے لڑ سکتے تھے اس لیے انہی ہتھیاروں کی ٹریننگ شروع کر دی۔ زیادہ ضروری یہ تھا کہ مسلمان نوجوان جسمانی لحاظ سے تندرست اور توانا ہو جائیں۔ انہیں کہا گیا کہ وہ ہندوؤں کی طرح صبح سویرے اٹھ کر باہر دوڑ لگایا کریں۔

اس طرح ہم نے بھی خانہ جنگی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ میں نے ایک

غلطی کی جس کا احساس مجھے بہت بعد میں ہوا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں دانشمند نہیں تھا اور میں صرف لٹھ باز قسم کا لیڈر تھا۔ میری جان پہچان بلکہ اٹھنا بیٹھنا ہندو اور سکھ جوانوں کے ساتھ بھی تھا۔ میں نے اُن پر خوف پیدا کرنے کے لیے انہیں اس قسم کی جھوٹی باتیں بتانی شروع کر دیں کہ ہم بندوقیں اور پستول اکٹھے کر رہے ہیں اور ضرورت کے وقت گرینیڈ بھی آ جائیں گے۔ میں انہیں یہ بھی بتاتا تھا کہ میں سب کا لیڈر ہوں اور میں یہاں کسی ہندو کو سلامت نہیں رہنے دوں گا۔

یہ تو سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ لڑائی مارکٹائی کا لیڈر میں ہی ہوں۔ میں اُس وقت محسوس نہ کر سکا کہ میں اپنی تیاریوں کے متعلق ہندوؤں کو جو جھوٹی باتیں بتا رہا ہوں انہیں وہ سچ سمجھ کر اپنے ہاں بھی ہتھیار چوری چھپے اکٹھے کر رہے ہیں۔ میں سینہ تانے پھرتا اور مسلمان نوجوانوں اور جوانوں کو حکم اور ہدایات دیتا رہتا تھا۔

گاؤں کے ہندو اور سکھ لیڈروں نے جو دراصل گاؤں کے بوڑھے اور اچھی حیثیت کے لوگ تھے اپنا رویّہ بدل لیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو پیار اور احترام سے سلام کرنے شروع کر دیئے اور ایسا سلوک شروع کر دیا جیسے وہ ہمارے سگے بھائی بن گئے ہوں مگر انہوں نے جنگی تیاریاں جاری رکھیں بلکہ کچھ تیز کر دیں۔ ان لیڈروں نے ہمارے بزرگوں کی خاطر تواضع اور اُن کے ساتھ میل ملاقات کا سلسلہ شروع کر دیا۔

میری نظر اپنی جنگی تیاریوں پر تھی۔ میں نے سیاست کو سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ یہ مجھے سمجھ آ گئی۔ دراصل الیکشن ہونے والے تھے۔ مسلمان پاکستان کے نام پر ووٹ مانگ رہے تھے اور مسلم لیگ کے امیدواروں کو کامیاب کرنا چاہتے تھے۔ کانگرس ہندوؤں کی جماعت تھی لیکن اس کے لیڈر یہ دعویٰ اور پروپیگنڈہ کرتے تھے کہ کانگرس مسلمانوں کی بھی نمائندہ جماعت ہے اور اس کا

بنیادی مقصد متحدہ ہندوستان کی آزادی ہے۔ افسوس اس پر آتا تھا کہ کچھ مسلمان
جی کانگرس میں تھے جو مسلمانوں کو گمراہ کرتے تھے۔ ہمارے گاؤں کے ہندو اب یہ
کوشش کر رہے تھے کہ گاؤں کے مسلمان کانگرس کے امیدوار کو ووٹ دیں۔ اس
مقصد کے لیے وہ ہمارے بزرگوں کو محبت اور بھائی بندی کا جھانسہ دے
رہے تھے۔

ہمارے بزرگ کچھ ایسے بھی تھے جو ہندوؤں کے جال میں پھنسنے کی سوچ
رہے تھے۔ میرے والد صاحب نے ہندوؤں سے کہہ دیا تھا کہ بے شک
وہ اقلیت میں ہیں اور یہ علاقہ پاکستان میں نہیں آئے گا، لیکن وہ قوم سے
الگ نہیں ہو سکتے لہٰذا ووٹ مسلم لیگ کو دیں گے۔ کچھ مسلمان ایسے تھے
جو کسی نہ کسی وجہ سے ہندوؤں کی باتوں میں آتے جا رہے تھے۔ یہ بات مجھے
اپنے جانباز گروپ کے دو تین نوجوانوں نے بتائی تھی۔

ایک روز میں اپنے ان دو تین دوستوں کے ساتھ اُن مسلمانوں کی ایک
محفل میں چلا گیا جو ہندوؤں کے قبضے میں جا رہے تھے۔ ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ
آج وہ اکٹھے ہو رہے ہیں اور ہندو لیڈر بھی ان کے پاس آ رہے ہیں۔ ہم وہاں
گئے تو ہندو آ چکے تھے۔ وہ پانچ تھے۔ یہ قصبے کے سرکردہ لوگ تھے۔ مسلمان آٹھ
تھے۔ یہ باقاعدہ کانفرنس تھی۔ ہم وہاں بن بلائے مہمان بن کر بیٹھ گئے۔ ایک
ہندو نے ہمیں وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ ایک مسلمان نے بھی کہا کہ وہ کوئی
ضروری بات کریں گے اس لیے ہم وہاں نہ بیٹھیں۔

میں ہندوؤں پر برس پڑا۔ پھر مسلمانوں کو شرمسار کیا اور انہیں کہا کہ یہ ہندو
تمہارے دشمن ہیں اور ان کی دوستی دشمنی سے زیادہ خطرناک ہے۔ میرے دوستوں
نے بھی بہت کچھ کہا۔ مسلمان کچھ شرمسار ہو گئے۔ ہندوؤں نے ہماری محبت اور
شفقت سے خاموش کرانے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب نہ ہوئے
تو ذرا غصے میں بولے۔

میں دھمکیوں اور دھتکار پر اُتر آیا اور آخر میں انہیں یہ کہہ کر وہاں سے
اٹھنے پر مجبور کر دیا کہ اس شہر سے انہیں ایک بھی مسلمان کا ووٹ نہیں ملے گا۔
وہ سخت غصے کی حالت میں چلے گئے تو ہم نے اپنے مسلمان بزرگوں کے ساتھ
بات کی۔ انہوں نے اس خطرے کا اظہار کیا کہ ہندو چونکہ اکثریت میں ہیں اور
سکھ بھی ان کے ساتھ ہیں، اس لیے وہ مسلمانوں کو کئی طریقوں سے پریشان
کریں گے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ہندو باقاعدہ لڑائی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔
مطلب یہ تھا کہ ہمارے بعض بزرگ ہندوؤں سے خوف زدہ تھے۔ میں نے
ان کا حوصلہ بڑھایا اور انہیں کہا کہ ہم بھی باقاعدہ لڑائی کی تیاریاں کر رہے ہیں
اور ہم ہندوؤں کو ماریں گے اُن سے مار نہیں کھائیں گے۔

مجھے معلوم ہو گیا کہ ہندو سکھوں کو ساتھ ملا کر دو محاذوں پر لڑ رہے ہیں۔
ایک جنگی محاذ تھا جس کی وہ تیاری کر رہے تھے اور دوسرا الیکشن کا محاذ تھا
جس کی فتح کے لیے وہ مسلمانوں کو محبت اور دھمکیوں سے بھی اپنے ساتھ
ملانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے اپنے جانباز دستے کو یہ ڈیوٹی
بھی دے دی کہ وہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے پھندے میں پھنسنے سے روکیں
اور انہیں بتائیں کہ ہم جنگی محاذ بھی تیار کر رہے ہیں۔

فوراً اس مہم پر عمل شروع ہو گیا۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق کلہاڑی
یا لاٹھی اٹھائے ہندوؤں کے درمیان سینہ تان کر پھرنا اور انہیں طنزیہ باتیں
کہنی شروع کر دیں۔ مجھے یقین تھا کہ ہندو مجھے اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں
کیسا آدمی ہوں اس لیے وہ مجھے للکارنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اب
تو انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ میں نوجوانوں کا فوجی اور بڑوں کا سیاسی لیڈر
بن گیا ہوں۔

میں نے جنگی یعنی جسمانی ٹریننگ اور تیز کر دی۔ لڑکوں نے ایک ایسی جگہ
اکھاڑہ کھودا جو ہندوؤں کے مکانوں کے پچھواڑے میں تھی۔ دائیں اور بائیں بھی

ایک ایک مکان کا پچھواڑا تھا۔ میں چونکہ شو بازی کا عادی تھا اس لیے میں نے اپنے دوستوں سے کہا تھا کہ کافروں کے سینے پر اکھاڑا کھود و اور انہیں دکھاؤ کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ چار اور اکھاڑے قصبے کے باہر مختلف جگہوں پر کھودے گئے تھے۔ ہر جگہ گتکے اور لٹھ بازی وغیرہ کی ٹریننگ اور مشق ہوتی تھی۔ میں ہر ایک اکھاڑے میں جاتا اور افسروں کی طرح سب کا معائنہ کیا کرتا تھا۔

ایک روز میں اُس اکھاڑے میں گیا جو ہندوؤں کے پچھواڑے کھودا گیا تھا۔ وہاں لڑکے ابھی کم آتے تھے۔ ایک لڑکے نے ایک مکان کے پچھواڑے کی طرف اشارہ کر کے مجھے دو کھڑکیاں دکھائیں جو اس طرف کھلتی تھیں اور بتایا کہ کل ان کھڑکیوں میں دو ہندو لڑکیاں شام تک کھڑی لڑکوں کو کسرت کرتے دیکھتی رہی تھیں۔ اس لڑکے کے لہجے میں شرارت کا رنگ تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک کھڑکی کھلی اور دو لڑکیاں نظر آئیں۔ فوراً بعد ایک اور کھڑکی کھلی اور تیسری لڑکی نظر آئی۔ یہ لڑکی تینوں میں خوبصورت تھی۔ دوسری دو بھی خوبصورت ہی تھیں لیکن تیسری میں کشش زیادہ تھی۔ اسے مَیں پہلے سے جانتا تھا۔ ہندو سکھ لڑکیاں باہر نکلا کرتی تھیں۔ ہم انہیں اکثر دیکھا کرتے تھے۔ مَیں نے تینوں لڑکیوں کو کھڑکیوں میں کھڑے دیکھا تو میں اسی اکھاڑے میں شام تک موجود رہا۔ لڑکیاں بھی وہیں کھڑی لڑکوں کو دیکھتی رہیں۔ لڑکے بھی انہیں دیکھتے تھے۔ شام کے اندھیرے نے لڑکیوں کو چھپا لیا اور ہم سب انہی کے متعلق باتیں کرتے گھروں کو چلے گئے۔

اگلے روز لڑکے اکھاڑے میں گئے۔ میں دوسرے کسی اکھاڑے میں جانے کی بجائے اسی اکھاڑے میں گیا۔ لڑکیوں نے کھڑکیاں کھول دیں۔ دو تین لڑکے زیادہ شرارتی تھے۔ انہوں نے لڑکیوں کے ساتھ کچھ گندہ مذاق کیا۔ یہ مذاق مجھے بُرا نہیں لگا۔ میری بھی ذہنی سطح ایسی ہی تھی۔ میں ان لڑکیوں کو دیکھتا رہا۔ ان میں تیسری لڑکی جس کا نام بینا کماری تھا مجھے دیکھ کر مسکرائی۔

مَیں محض شرارت کے ارادے سے آہستہ آہستہ کھڑکی تک چلا گیا۔ بینا کو ہندو لڑکی سمجھ کر مَیں نے اُس کے ساتھ مذاق کیا۔

اُس نے سنجیدہ ہو کر کہا —— "ہم تمہیں اتنے شوق سے دیکھنے کے لیے یہاں کھڑی ہوتی ہیں اور تم ایسے گندے مذاق کرتے ہو۔"

"یہاں دیکھنے والی کیا چیز ہے؟" مَیں نے کہا —— "لڑکے ورزش کرتے ہیں۔ کوئی تماشہ تو نہیں دکھاتے۔"

"تم لوگوں کے جسم اچھے لگتے ہیں۔" بینا نے کہا —— "ہمارے مردوں کے جسم دکانوں پر بیٹھ بیٹھ کر بھدّے ہو جاتے ہیں۔"

مَیں فوراً ہی شوخی اور شرارت بھول گیا اور اس کے ساتھ کسی اور لہجے میں باتیں کرنے لگا۔ یہ بتانا ضروری نہیں کہ ہمارے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ وہاں سے ہٹ کر مَیں جب اپنے اکھاڑے میں آیا تو میرے دوستوں نے میرے ساتھ مذاق کیے لیکن میں بہت سنجیدہ تھا۔ مَیں نے انہیں کہا —— "یار، ان کے ساتھ مذاق نہ کیا کرو۔ کھڑا رہنے دو۔ دیکھنے دو۔ ہمارا کیا لیتی ہیں۔"

میں نے کسی دوسرے اکھاڑے میں جانا چھوڑ دیا۔ ہر شام اسی اکھاڑے میں آتا۔ بینا اپنی سہیلیوں کے ساتھ ایک کھڑکی میں کھڑی ہوتی۔ میں اسے کبھی تو دیکھ لیتا اور کبھی ذرا قریب جا کر ایک آدھ بات کر لیتا۔ دس بارہ دنوں بعد میرے دوستوں نے نہ مجھے اکھاڑے میں دیکھا نہ بینا کو کھڑکی میں۔

اگلے روز ایک دوست نے مجھے کہا —— "یار کل تم نہیں آئے تو بینا بھی نہیں آئی۔ دوسری دو لڑکیاں کھڑکیوں میں ہمیں دیکھتی رہی تھیں۔"

میں اس دوست کو راز کی یہ بات نہیں بتا سکتا تھا کہ کل شام میں اور بینا اکٹھے تھے۔ اس دوست نے مجھے یہ بتا دیا کہ اکھاڑے میں لڑکے کسرت میں اتنی دلچسپی نہیں لیتے جتنی لڑکیوں میں لیتے ہیں۔ میری دلچسپی بینا کے ساتھ تھی اس لیے میں نے پروا نہ کی کہ دوسرے کس میں دلچسپی لیتے ہیں۔

میرے کھیت قصبے سے تھوڑی ہی دور تھے ۔ میں نے گزشتہ شام بینا سے کہا تھا کہ مجھے فلاں جگہ کھیتوں میں ملے ۔ وہ بلا جھجک آ گئی ۔ اس نے بڑی بے تابی سے محبت کا اظہار کیا اور مجھے بتایا کہ اُس کا رشتہ جس آدمی کے ساتھ طے ہوا ہے، وہ بہت ہی بھدّا اور سخت کنجوس آدمی ہے ۔

میں اس ہندو کو جانتا تھا وہ بینا کا نوکر بننے کے قابل بھی نہیں تھا ۔ بینا نے میرے پاؤں پکڑ کر التجا کی کہ وہ دل میں پاک محبت لے کر آئی ہے ؎ اور میں اسے فاحشہ اور بدکار لڑکی نہ سمجھوں ۔

"میں نے سُنا ہے کہ تم جتنے خوبصورت ہو اور طاقتور ہو اتنے ہی دلیر ہو۔" اُس نے کہا ۔ "میں گھر سے آ جاؤں گی اور مسلمان بھی ہو جاؤں گی ۔ تم دلیری کرو اور میرے ساتھ شادی کر لو ۔ مجھے ہندوؤں سے نفرت ہے ۔ میں ہندو کے گھر پیدا ہوئی ہوں لیکن مجھے مسلمان اچھے لگتے ہیں" ۔

میری دلیری اور سرکشی میں کسی کو شُبہ نہیں تھا ۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں اُس کی خاطر جان قربان کر دوں گا ۔ میرا مسئلہ یہ بھی تھا کہ میری منگنی ہو چکی تھی ۔ میری عمر چھبیس سال ہو گئی تھی ۔ شادی کسی وجہ سے رُکی ہوئی تھی ۔ یہ لڑکی چونکہ برادری کی تھی اس لیے مجھے قبول کرنی تھی ورنہ میری پسند کی نہیں تھی ۔ بینا سامنے آئی تو میری منگیتر مجھے اور زیادہ بُری لگنے لگی ۔

میں نے بینا سے کہا کہ میں اس کے ساتھ پاک محبت کروں گا اور ایسی محبت کروں گا کہ پنجاب کے لوگ ہیر رانجھے اور سوہنی مہینوال کو بھول جائیں گے اور اس کے بعد یوں ہوا کہ لوگ مجھے بھول گئے اور میں لوگوں کو بھول گیا ۔ دوستوں کے ساتھ ملاقاتیں ہوتی تھیں ۔ وہ مجھ سے بینا کی باتیں پوچھتے تھے اور میں اپنی شوباز عادت کے مطابق انہیں ہر ایک بات بتاتا اور سرا اونچا کر لیتا تھا ۔

بہت دنوں کے بعد مجھے پتہ چلا کہ دوسری دو ہندو لڑکیوں کے ساتھ میرے چار پانچ دوستوں کے دوستانے پیدا ہو گئے ہیں اور میرے دوست رقابت،

کے جوش میں آپس میں لڑ بھی چکے ہیں ۔ میں نے اُدھر توجہ نہ دی کیونکہ میری توجہ اب کہیں اور قید ہو گئی تھی ۔ پھر مجھے یہ بھی ہوش نہ رہا کہ ہندو اور مسلمان کیا کر رہے ہیں ۔

ایک روز پتہ چلا کہ کانگرسی امیدوار الیکشن جیت گیا ہے ۔ میرے لیے یہ کوئی خاص واقعہ نہیں تھا ۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ میری توجہ ہٹ جانے سے مسلمان نوجوانوں کی جنگی ٹریننگ ختم ہو گئی تھی ۔

میں چونکہ آپ کو عشق و محبت کا کوئی افسانہ نہیں سنا رہا اس لیے میں افسانوں کی طرح منظر کشی نہیں کروں گا ۔ اتنا ہی بتانا کافی ہونا چاہیئے کہ مجھ پر ایک نشہ اور خمار طاری ہو گیا تھا ۔ بینا کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا ۔ ایک روز بینا سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت خوش تھی ۔

"پاکستان تو سمجھو بن گیا" اس نے کہا ۔ "پندرہ اگست کے فوراً بعد میں مسلمان ہو جاؤں گی ۔"

میں حیران تھا کہ پاکستان کہاں سے بن گیا ہے ۔ اُس نے بتایا کہ کل شام ریڈیو سے ملک کی تقسیم کا اعلان ہو گیا ہے ۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں پتہ چلا کہ وہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کی بات کر رہی تھی ۔ میں نے ریڈیو سُنا ہی نہیں تھا ۔ میں بھی خوش ہوا کہ پاکستان بن جائے گا جس میں مسلمانوں کی بادشاہی ہو گی ۔ پھر میں بینا کو شاہانہ طریقے سے اپنے گھر لے جا کر دُلہن بناؤں گا ۔ بینا نے یہ بھی بتایا کہ ہمارا قصبہ ہندوستان میں ہی رہے گا اور پاکستان لاہور تک ہو گا ۔ میں نے سوچا ہی نہیں کہ ہمارا قصبہ پاکستان میں نہیں ہو گا تو کیا ہو جائے گا ۔

مجھے کچھ یاد نہیں کہ اس کے بعد ملک میں کیا ہوتا رہا ۔ مجھے اپنے قصبے کے حالات اور واقعات کا بھی علم نہیں تھا ۔ اگست کا دوسرا ہفتہ جیسے ۳ جون کے فوراً ہی بعد آ گیا ہو ۔ ایک روز ہمارے گھر میں قصبے کے سرکردہ مسلمانوں کی میٹنگ ہوئی ۔ میں بھی اس میں بیٹھا تھا ۔ باہر کے بھی تین چار بزرگ آئے ہوئے تھے ۔

انہوں نے بتایا کہ کئی جگہوں پر ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کو لوٹنا اور قتل کرنا شروع کر دیا ہے۔ مسلمان لڑکیوں کی بے حرمتی کی وارداتیں بھی سننے میں آئیں۔

اس میٹنگ میں غور ہو رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ مسلمان جم کر لڑنے کے قابل نہیں تھے کیونکہ ان کے پاس ہتھیار نہیں تھے، اور ان کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ یہی ایک صورت سامنے آئی تھی کہ پاکستان کو ہجرت کی جائے اور جلدی کی جائے۔ اپنے گھر اور اتنا ڈھیروں سامان اور زمینیں چھوڑ کر کون جانے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پاکستان اتنی بڑی قربانی مانگے گا۔ ہمارے قصبے کا کوئی بھی بزرگ ہجرت کے لیے تیار نہ ہُوا۔ باہر سے آئے ہوئے مسلمان بتا رہے تھے کہ ہندوؤں اور سکھوں کے ارادے بہت خطرناک ہیں لہٰذا وہ وقت ضائع نہ کریں۔ وہ یہ مشورہ لے کے آئے تھے کہ بیل گاڑیاں، گھوڑے اور دیگر مویشی اکٹھے کر کے منظم طریقے سے زیادہ سے زیادہ قیمتی سامان لے کر فوراً روانہ ہُوا جائے۔ انہوں نے جو واقعات سنائے وہ بڑے خوفناک تھے۔

سب اپنے گھروں کو چلے گئے تو رات کو والد صاحب بہت دیر میرے ساتھ ہجرت کے مسئلے پر باتیں کرتے رہے۔ وہ ہجرت کے لیے تیار تھے اور اسے عملی صورت دینے اور ساتھ لے جانے والے سامان کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ میری امیّ اور بہنیں اتنی پریشان ہوئیں کہ رو پڑیں۔ والد صاحب نے انہیں پاکستان کی اتنی اچھی باتیں سنائیں کہ ان کا دل بہل گیا۔ وہ کسی جنّت کی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔

• میں اپنے ساتھ جو کچھ لے جانا چاہتا تھا وہ بینا تھی۔ رات گزر گئی۔ میں نے صبح ہوتے ہی اپنے خفیہ ذریعے سے بینا کو بلایا۔ اس نے جواب بھیجا —— "میں باہر نہیں آسکتی۔ میرے گھر کے پچھواڑے اُس کھڑکی کے سامنے آجاؤ جہاں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔"

کچھ سوچے سمجھے بغیر میں وہاں چلا گیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ کوئی دیکھ لے گا۔ کھڑکی

بند تھی۔ کھڑکی کھلی تو بینا نظر آئی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ مجھے شک ہُوا کہ اس کے گھر والوں پر راز فاش ہو گیا ہے، اسی لیے باہر نہیں آئی اور پریشان بھی ہے۔ میں یہ ارادہ لے کر کھڑکی تک گیا کہ اسے کہوں گا کہ ابھی باہر آؤ ہم پاکستان جا رہے ہیں اور اسے میں ساتھ لے جاؤں گا، مگر اُس نے مجھے کچھ کہنے کی مہلت نہ دی۔ بولی۔ "یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ میں ملنے سے انکار کر دیتی لیکن تمہارے ساتھ کچھ وقت اچھا گذارا ہے اس لیے تمہیں بلا لیا۔ میری تمہاری محبت ختم ہے۔"

"تمہارے گھر والوں کو پتہ چل گیا ہے؟" میں نے پوچھا اور کہا —— "ہم پاکستان جا رہے ہیں۔ چلو ...."

اس نے مجھے بات پوری نہ کرنے دی۔ بولی —— "میں تمہارے ساتھ ایک نیکی کرتی ہوں۔ پاکستان جانا ہے تو آج شام سے پہلے نکل جاؤ۔ بہنوں کو فوراً یہاں سے نکال لو۔ مجھے یہ بات بتانی نہیں چاہیئے تھی لیکن تمہاری اور تمہاری بہنوں کی جوانی پر رحم آتا ہے۔ تمہیں اس نیکی کا صلہ دینا چاہتی ہوں کہ میں نے تمہیں کہا تھا کہ میری محبت پاک ہے اور تم نے محبت کو پاک رکھا۔"

میں معلوم نہیں کیا کہنے لگا تھا لیکن اس نے مجھے بولنے ہی نہ دیا۔ کہنے لگی —— "مجھے تمہارے ساتھ محبّت نہیں تھی۔ میں اپنا دھرم کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اپنے دھرم کے لیے کیا ہے۔ میری سہیلیوں نے بھی اپنے دھرم کے لیے یہی کام کیا ہے۔ میں تمہارے اکھاڑے اور تمہاری تیاریاں ختم کرنا چاہتی تھی۔ تم پوچھتے ہو کہ کیا میرے گھر والوں کو پتہ چل گیا ہے؟ انہوں نے ہی مجھے کھڑکی میں کھڑا کیا تھا۔ میری سہیلیوں کے ماں باپ کو بھی معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہی ہیں۔ میں اپنا کام کر چکی ہوں۔ جاؤ، آج شام سے پہلے نکل جاؤ۔"

اگر کھڑکی کی سلاخیں نہ ہوتیں تو میں اندر جا کر اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ اس نے کھڑکی بند کر دی اور میں پاگلوں کی طرح وہاں کھڑا رہا۔ وہاں سے چلا تو غصّے اور خفت

سے میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے ۔ گھر پہنچ کر بھی مجھے احساس نہ ہوا کہ میں گھر میں ہوں ۔ یہ بھی یاد نہ رہا کہ اُس نے کہا تھا کہ شام سے پہلے پاکستان چلے جاؤ ۔

شام گہری ہوتے ہی آسمان ٹوٹ پڑا ۔ ایسے لگتا تھا جیسے ایک فوج نے گاؤں پر حملہ کر دیا ہو ۔ یہ قصبے کے ہندوؤں اور سکھوں کا حملہ تھا ۔ میں نے کلہاڑی اٹھائی، چادر پگڑی کی طرح سر اور چہرے پر لپیٹی اور باہر نکل گیا ۔ ہر طرف ہندوؤں اور سکھوں کے جے کارے اور مسلمانوں کی چیخ و پکار تھی ۔ لالٹینیں بھی تھیں اور مشعلیں بھی جو کافروں نے اٹھا رکھی تھیں ۔ کوئی مسلمان مقابلے کے لیے باہر نہیں آ رہا تھا ۔

میں بینا کے گھر جا پہنچا ۔ اندر روشنی تھی ۔ دروازہ کھلا ہوا تھا ۔ یہ ہندوؤں کا گھر تھا ۔ انہیں کوئی خطرہ نہیں تھا ۔ صحن میں اس کا باپ دروازے کی طرف آ رہا تھا ۔ میں نے کلہاڑی کے دو وار کر کے اُس کی کھوپڑی کھول دی ۔ بینا اور اس کی ماں دوڑتی اور چیختی آئیں ۔ میں نے پہلے ماں کو ختم کیا ۔ بینا اندر کو بھاگی ۔ میں نے اُسے دروازہ بند نہیں کرنے دیا ۔ اندر جا کر پہلا وار اس کے سر پر کیا ۔ وہ گری تو کلہاڑی سے اس کے چہرے کا قیمہ کر دیا ۔

وہاں سے دوڑتا باہر آیا ۔ یہ ہندوؤں کا محلہ تھا ۔ میرا سر اور چہرہ چادر میں تھا ۔ اندھیرا بھی تھا ۔ کہیں روشنی بھی تھی ۔ لوگ بھاگ دوڑ رہے تھے ۔ کاٹ رہے تھے، کٹ رہے تھے ۔ دُور کہیں مکان جل رہے تھے ۔ میرا رُخ اپنے گھر کی طرف تھا ۔ مگر وہاں پہنچا تو وہاں شعلے تھے ۔ ہندوؤں اور سکھوں کا ہجوم تھا ۔ جلنے سے پہلے گھر لُٹ چکا ہو گا اور میری بہنیں ؟ —— آج تک پتہ نہیں چلا کہ زندہ ہیں یا قتل کر دی گئی تھیں یا زندہ جل گئی تھیں ۔

میں جس ذہنی اور جسمانی حالت میں پاکستان پہنچا وہ ایک الگ کہانی ہے ۔ ایسی کہانیاں آپ نے بہت سُنی ہوں گی ۔ یہ بھی اسی طرح کی ہے ۔ میں ساری عمر پچھتانے کے لیے زندہ ہوں ۔ اگر میں ہندو کے اس خوبصورت فریب میں نہ آ جاتا تو قصبے کے مسلمان خصوصاً نوجوان مقابلہ کرتے اور انہیں اتنا نقصان نہ

ہوتا ۔ ہندوؤں نے دیکھ لیا تھا کہ ہم ان سے مار نہیں کھائیں گے ۔ انہوں نے صرف مجھے گمراہ نہیں کیا ۔ میرے چند اور دوستوں کو بھی اسی قسم کے فریب میں پھانس کر ہماری ساری تیاریاں ختم کر دی تھیں ۔ ہمارے دماغوں پر ایسا قبضہ کیا کہ ہم اپنی بہنوں کی عصمتیں بھی نہ بچا سکے ۔

میں نے یہ کہانی اس لیے سنائی ہے کہ ہمارے وہ پاکستانی نوجوان جو ہندو کی بھیجی ہوئی لفظی لذت کے نشئی ہو گئے ہیں، انہیں ہوش آ جائے کہ ہندو مسلمان کو شکست دینے کے لیے اپنی بیٹیوں کی عصمت تک داؤ پر لگا دیتا ہے ۔ پاکستان میں آ کر جب مہاجرین سے اُٹھنا بیٹھنا ہوا تو میں نے اپنی آپ بیتی سے ملتی جُلتی بہت سی کہانیاں سُنیں ۔ اگر آپ اپنے دُشمن کو پہچاننا چاہتے ہیں تو میری آپ بیتی کو افسانہ نہ کہہ دینا ۔

اندھیری سیڑھیاں، روشن منزل

بیوی کا غلام ہونا کسی کو بھی پسند نہیں، اور اُس آدمی کو بھی کوئی پسند نہیں کرتا جو اپنی بیوی کا غلام ہو جائے۔ کچھ ایسی ہی وجہ تھی کہ ارشاد علی کو ہم عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا کرتے تھے۔ ہمارے محلّے میں آئے اُسے دس سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ اس کی بیوی ملنسار ہے۔ محلّے کے ہر گھرانے کے ساتھ اس کے گہرے تعلقات ہیں۔ ہر کسی کی غمی شادی پر موجود ہوتی ہے لیکن ارشاد علی خاموش سا رہتا ہے۔ ان کی اولاد جوان ہو گئی ہے لیکن ارشاد جوان اولاد کو ابھی تک دُودھ پیتے بچے سمجھتا ہے۔ بے حد پیار کرتا ہے۔ کہتے ہیں گھر میں برتن دھونے اور جھاڑو دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس کی بیوی ایسی نہیں کہ اسے اپنے رعب داب میں رکھے یا لڑتی جھگڑتی رہے۔ وہ تو خوش طبع عورت ہے۔ ان کے قریبی پڑوسی بتاتے ہیں کہ اتنے عرصے میں اس گھر سے کبھی جھگڑے تکرار کی آواز نہیں سنائی دی۔ جہاں تک چار دیواری کی دنیا کے دستور کا تعلق ہے، لڑائی جھگڑا اُسی گھر میں نہیں ہوتا جس میں خاوند ہتھیار ڈالے رکھے۔ ارشاد علی مردوں کی محفل میں بیٹھا بزدل اور رکھا رکھا نہیں لگتا۔ بہرحال ہمارے لیے وہ غیر اہم سا انسان تھا۔ ایک عام سا انسان جسے اوسط درجے سے بھی کم سمجھا جاتا تھا مگر دو ماہ گزرے اس کے متعلق اس کے ایک ملنے

والے نے ایسا انکشاف کیا جس نے ارشاد علی کو ایک اہم اور قابلِ تقلید شخصیت
بنا دیا ہے۔ اس ملنے والے کو ہم نہیں جانتے تھے۔ اس نے مجھ سے ارشاد علی کا
گھر پوچھا تو باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ ارشاد ایک کہانی کا کردار ہے۔
میں نے ایک روز اُسے اپنے گھر بٹھا لیا اور اُسے کہا کہ وہ اپنی کہانی سنائے۔
وہ چونکہ کسی اور شہر میں جنا پلا اور ہمارے ہاں کرایہ دار کی حیثیت سے آباد تھا،
اس لیے ہم اس کے پس منظر سے واقف نہیں تھے۔

اُس نے مجھے جو آپ بیتی سُنائی وہ میں اُسی کے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔
اسے آپ "چار دیواری کی دُنیا" کے عنوان سے قبول فرمالیں یا "پاکستان ،
ایک پیاز دو روٹیاں" کے زُمرے میں شامل کریں۔ میں کہانی سُنا دیتا ہوں۔

"مسلمان کی اس شان سے تو آپ واقف ہیں کہ اسے جب دولت
ہاتھ آجاتی ہے تو وہ پہلے ایمان کو خیرباد کہتا ہے، پھر پُرانی بیوی کو چھُٹی دے
کر نئی بیوی لاتا ہے۔ جنگِ عظیم دوم میں زیادہ تر دولت تو ہندوؤں نے
ٹھیکیداریوں اور سپلائی کے کاروبار میں کمائی تھی۔ بعض مسلمانوں نے بھی ہاتھ
مار لیا تھا لیکن مسلمانوں کو فوج میں عہدے بہت ملے کیونکہ مسلمان زیادہ تر فوج
میں تھے۔ کئی جمعداروں (جو آج کل نائب صوبیدار کہلاتے ہیں) اور صوبیداروں
کو جنگ کی ضرورت کے تحت کپتان اور میجر وغیرہ بنا کر صاحب بہادر بنا دیا
گیا تھا۔ ان میں سے بعض نے صوبیداری کے زمانے کی اَن پڑھ اور گھریلو قسم
کی بیویوں کو طلاقیں دے کر ایڈوانس قسم کی لڑکیوں کے ساتھ شادیاں کر لی
تھیں۔ آپ ایڈوانس کا مطلب سمجھتے ہیں۔ ان لڑکیوں نے بوڑھے کپتانوں،
میجروں اور کرنیلوں کی عزت کو جوان سال فوجی افسروں کے ساتھ دوستانے
گانٹھ کر خوب خراب کیا۔ اُدھر پرانی بیویاں جنہوں نے بیس بیس پچیس پچیس سال
ان خاوندوں کے ساتھ وفاداری اور خدمت گزاری میں گزارے تھے، اُجڑ کر
اپنے والدین کے دروازوں پر جا بیٹھیں یا دربدر خراب ہوئیں.....

"میں بھی ایسے ہی حادثے کا شکار ہوا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں جنگِ عظیم
انگریزوں کے لیے بہت ہی خطرناک صورت اختیار کر گئی تھی۔ ہندوستانی فوج
جو انگریزوں نے پال پوس کر رکھی ہوئی تھی، آدھی سے زیادہ ماری گئی تھی۔
یہ صاف نظر آرہا تھا کہ جرمنی کا برطانیہ پر قبضہ ہو جائے گا۔ اِدھر جاپانیوں نے
حملہ کر کے برما میں ہندوستانی فوج کو تباہ و برباد اور پسپا کر دیا۔ انگریزوں
نے ہندوستان میں بھرتی کی رفتار بہت تیز کر دی۔ نئی پلٹنیں بنائیں۔ ان پلٹنوں
اور فوج کے دوسرے شعبوں کے لیے افسروں کی ضرورت تھی۔ انگریزی
حکومت نے ایسے پرانے جمعداروں اور صوبیداروں کو جو ٹوٹی پھوٹی انگریزی
بول سکتے تھے کنگ کمشن دے کر کپتان بنا دیا۔ یہ لوگ اپنے کام کے ماہر تھے۔
کسی مزید ٹریننگ کی ضرورت نہیں تھی۔ انہیں دفتروں میں بیٹھے بیٹھے اعلیٰ
عہدے مل گئے اور اُن کا شمار صاحب بہادروں میں ہونے لگا۔ محاذوں
پر موت کی رفتار تیز تھی۔ اس کے مطابق ترقیوں کی رفتار بھی تیز رکھی گئی۔
میں چونکہ اپنے باپ کے ساتھ چھاؤنی میں رہتا تھا اس لیے میں دیکھتا رہتا
تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے دو بوڑھے کپتانوں کو ایک سال کے اندر
کرنل بنتے دیکھا تھا.....

"میرا باپ جمعدار تھا اور سپلائی کے محکمے میں تھا۔ اُسے چونکہ فرنٹ
پر نہیں جانا تھا اس لیے اس کے مرنے کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ مر جاتا تو بہتر ہوتا۔
مرنے کی بجائے اُسے کپتان بنا دیا گیا۔ اُس وقت اُس کی عمر چالیس سال سے
کم تھی اور میری عمر نو سال کے قریب تھی۔ مجھ سے تین سال چھوٹی ایک بہن
تھی۔ ہماری بدقسمتی کہ ہمارا باپ انگریزی لکھ پڑھ سکتا تھا۔ اَن پڑھ ہوتا تو ہم
اچھے رہتے۔ اِدھر گھر میں اپنی زمین بہت تھی اور بہت بڑی حویلی بھی تھی۔ اس
طرح میرا باپ برادری میں بھی چوہدری تھا اور فوج میں بھی چوہدری بن گیا.....

"اس وقت تک ہمارے گھر میں پیار اور خوشیاں تھیں۔ باپ ہمارے

ساتھ اتنا ہی پیار کرتا تھا جتنا ایک باپ کو کرنا چاہیئے۔ ہماری ماں کو بھی وہ بہت چاہتا تھا۔ ہماری ماں اَن پڑھ، بھلی مانس اور دیہاتی عورت تھی جو خاوند کو خوش رکھنے کو اپنا ایمان سمجھتی تھی.....

"کپتان بن کر باپ کی گردن تھوڑی سی اکڑ گئی۔ وہ افسروں کے میس میں بھی جانے لگا جہاں انگریز، ہندو، اینگلو انڈین اور دوسرے افسر جاتے، کھاتے پیتے اور شہزادوں کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک سال کے اندر ہی میرا باپ میجر بن گیا۔ اس عہدے نے اس کا دماغ خراب کر دیا۔ اس سے پہلے کبھی میری ماں گھر جانے کو کہتی تھی تو باپ کہا کرتا تھا کہ میں ایک دن بھی اکیلا نہیں رہ سکتا۔ میجر بن کر اُس نے خود ہی ماں سے کہا کہ مجھے تو معلوم نہیں کب چھٹی ملے، تم بچوں کو گھر لے جاؤ۔ میرے اور تمہارے والدین تمہارے لیے اور بچوں کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ ہم جبل پور (ہندوستان) سے گھر آئے تو تین مہینے گزر گئے۔ باپ نے ہمیں واپس نہ بلایا۔ ماں نے خود ہی تیاری کی اور ہمیں جبل پور لے گئی۔ میں اُس وقت چھوٹا تھا۔ پھر بھی میں نے محسوس کر لیا کہ باپ ہمیں اور ہماری ماں کو دیکھ کر خوش نہیں ہوا۔ اس کے طور طریقے بدلے ہوئے تھے.....

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری ماں اُداس اُداس رہنے لگی تھی۔ میرے باپ کو بہت بڑا بنگلہ مل گیا تھا۔ اس کے بڑے کمرے میں رات کو مہمان آیا کرتے تھے۔ یہ تو مجھے بڑے ہو کر خیال آیا کہ اس کمرے میں شراب پی پلائی جاتی تھی۔ جمعداری کے زمانے میں میرا باپ صرف سگریٹ پیا کرتا تھا۔ مختصر یہ کہ ہمارا باپ پورا صاحب بہادر بن گیا۔ گھر میں اس کی باتوں کا لہجہ اور طریقہ بھی بدل گیا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اب وہ ہماری ماں کو اپنی زندگی کی رفیقہ نہیں بلکہ نوکرانی سمجھتا ہے..... چند مہینے گزرے تو اس نے [illegible] چھٹی لی اور ہم سب کو گھر لے آیا۔ برادری سے [illegible]

کی۔ اُس وقت میری عمر دس سال ہو چکی تھی۔ میں نے یہ دیکھا کہ میرے ننہال میں کچھ بے چینی اور بدامنی سی پیدا ہو گئی تھی۔ اپنی ماں کو میں نے روتے بھی دیکھا۔ میری نانی بھی روتی تھی۔ اُدھر دادی بھی پریشان نظر آتی تھی۔ کوئی شدید گڑبڑ تھی۔ میرے باپ اور ماں کے درمیان ناراضگی پیدا ہو گئی تھی.....

"پھر ہمارے اوپر بم گرا۔ باپ نے دوسری شادی کر لی۔ یہ جرم اکیلے میرے باپ کا نہیں تھا۔ اس گناہ میں وہ باپ اور وہ ماں بھی شریک تھی جنہوں نے اپنی جوان بیٹی ایک ایسے آدمی کو دے دی تھی جس کی عمر لڑکی سے دگنی تھی اور جو دو بچوں کی ماں کا خاوند تھا۔ انہوں نے بیٹی میرے باپ کو نہیں ایک میجر کو دی تھی جو بہت ساری جائیداد کا مالک بھی تھا اور جس کی کرنیلی کے امکانات بھی روشن تھے۔ چار دیواری کی دنیا میں ہم اپنی لڑکیوں کی خرید و فروخت اسی طرح کیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے اس سے ہم نظریں پھیر لیا کرتے ہیں۔ میرے باپ کو ایسی بیوی کی ضرورت تھی جسے وہ انگریز، اینگلو انڈین، ہندو اور مسلمان افسروں میں اپنے ساتھ لے جا سکے۔ اس کے نتائج آپ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ایک بوڑھے کی جوان بیوی آزاد ہو کر جو گل کھلاتی ہے وہ آپ پاکستان میں بھی دیکھ رہے ہیں۔ میرے بیان کرنے کی ضرورت نہیں.....

"میرا باپ میری ماں کو بھی اپنے گھر رکھنا چاہتا تھا۔ ماں نے صاف جواب دے دیا اور طلاق مانگی۔ باپ کہتا تھا کہ مجھے اور میری بہن کو وہ ماں کے ساتھ نہیں رہنے دے گا۔ ماں نے کہا کہ وہ بچوں سے دستبردار نہیں ہوگی۔ میرے نانا سخت طبیعت کے تھے۔ ان پر چوٹ بھی بڑی سخت پڑی تھی۔ انہوں نے کہا کہ وہ طلاق لیں گے، بچے نہیں دیں گے۔ جھگڑا بڑھا تو برادری کے ریاست [illegible] آئے بزرگ میرے نانا کے پاس تصفیہ کرانے آئے۔ ان کے ساتھ میرا باپ [illegible] تھا۔ مجھے بہت سی باتیں یاد ہیں۔ [illegible] جھگڑا ہوا تھا.....

ایک بزرگ آدمی نے [illegible] تصفیہ یا [illegible] [illegible]

کسی گھر کا تنازعہ کچہری میں نہ جائے ۔ یہ ساری برادری کی توہین ہو گی ۔ میرا نانا
پھٹ پڑا ۔ اُس نے کہا ——— "ساری برادری کے سامنے میری بیٹی کو
بے گناہ اُجاڑا گیا ۔ برادری کے ایک گھرانے نے اپنے باپ کی عمر کے ایک
شادی شدہ آدمی کو اپنی بیٹی صرف اس لیے دی کہ یہ آدمی بڑا افسر بن گیا ہے
اور اس کی جائداد ہے ۔ سارا شہر کہ رہا ہے کہ ان لوگوں نے لڑکی بیچی ہے ۔ کیا
یہ برادری کی توہین نہیں ہوئی" ۔ میرے نانا نے گن گن کر بتایا کہ میرے باپ نے
لڑکی کے والدین کو نقد کتنا دیا اور کتنے ایکڑ زمین لڑکی کے باپ کے نام رجسٹری
کرائی ہے ۔ نانا نے کسی کو بولنے نہ دیا اور میرے باپ سے کہا کہ وہ کسی بھی عدالت
میں چلا جائے ، اُسے بچے نہیں ملیں گے .....

"نانا نے اس پنچایت کا مسئلہ بدل دیا اور کہا کہ اسی وقت طلاق دی جائے ۔
میرے باپ نے طلاق لکھ دی اور جب یہ کہا کہ وہ پانچ ہزار روپیہ حق مہر اور
ایک سو روپیہ ماہوار خرچ ادا کرے گا تو میرے نانا نے کہا ——— "میں نے
بیٹی شریعت کے حق مہر پر دی تھی اور میں نے کوئی خرچ نہیں لکھوایا تھا ۔ میں
نے اپنی بیٹی بیچی نہیں تھی ۔ میں تمہارے عہدے اور دولت پر تھوکتا ہوں —
اُس نے برادری کے ان پنچوں اور بزرگوں کو یہ کہ کر گھر سے اٹھا دیا کہ تم سب
ایک جوان لڑکی کا سودا پکا کرنے آئے ہو ۔ تم اس کا ساتھ صرف اس لیے
دے رہے ہو کہ یہ فوج کا افسر ہے اور برادری کا بڑا زمیندار ہے ۔ نانا نے کہا
——— "میں تمہیں آج بتا دیتا ہوں کہ جس لڑکی کو تم نے اس آدمی کے ہاتھ
بیچا ہے ۔ وہ تم سب کے مُنہ پر سیاہی ملے گی" .....

"محلے دار اور برادریوں والے گنہگار ہوتے ہوئے بھی اپنی توہین برداشت
نہیں کیا کرتے ۔ ہماری برادری نے میری ماں کے خلاف شرمناک باتیں مشہور
کر دیں ۔ میرا باپ نئی بیوی کو ساتھ لے کر چلا گیا ۔ میری ماں کی عمر غالباً تیس
سال سے کچھ کم ہی تھی ۔ ہمارے قریبی رشتہ داروں میں سے ایک آدمی

کی بیوی مر گئی تھی ۔ اُس نے پانچ چھ ماہ بعد میری ماں کے ساتھ شادی کر
لی ۔ وہ ایک اور شہر میں بڑی اچھی ملازمت میں تھا ۔ یہاں سے میری زندگی
کا دوسرا تلخ دور شروع ہوا ۔ اس قسم کی طلاقوں اور دوسری شادیوں میں بچے تباہ
ہو جاتے ہیں ۔ میں بھی بچہ ہی تھا ۔ آج تو میں ہر بات اور ہر سوال سمجھ لیتا
ہوں ، گیارہ بارہ سال کی عمر میں مجھے یہی سمجھ آئی تھی کہ مجھ سے لوگوں نے میرا
باپ ، میرے باپ کا پیار اور میرا گھر چھین لیا ہے ۔ مجھے جہلم پور والا بنگلہ وہاں
کا سکول ، وہاں کے دوست اور باپ کا پیار اور گھر کی خوشیاں یاد آتی تھیں ۔
باپ نے دوسری شادی کی تو ماں کی مسکراہٹیں غائب ہو گئیں اور اُن کی جگہ
آنسو بہنے لگے ۔ دادا دادی سے ملنا بند ہو گیا ۔ نانی نانا غصے اور افسوس
میں رہتے تھے .....

"اس کے بعد مجھے نیا باپ ملا جو میرے اصل باپ سے بہت مختلف تھا ۔
وہ سنجیدہ سا آدمی تھا ۔ اس نے مجھے معمولی سے ایک سکول میں داخل کرا دیا ۔
پہلی بیوی سے اس کا کوئی بچہ نہیں تھا ۔ اس نے مجھے اپنا بچہ سمجھنے کی کوشش
ہی نہ کی ۔ میری چھوٹی بہن کے ساتھ بھی اس نے کبھی پیار نہ کیا ۔ صاف پتہ
چلتا تھا کہ اُسے گھر میں ایک عورت کی ضرورت تھی ۔ میری ماں کے ساتھ اس
کا تعلق کاروباری سا تھا ۔ اس میں میں نے وہ جذبات نہ دیکھے جو میرے باپ
میں دوسری شادی سے پہلے ہوا کرتے تھے ۔ میں اپنے باپ کے پیار اور گھر
کا عادی تھا مگر یہاں ایسی سنجیدگی تھی جس سے شک ہوتا تھا کہ گھر کی فضا میں
کسی وجہ سے کھچاؤ ہے ۔ جس طرح ہر بچہ ہنسنا کھیلنا چاہتا ہے اسی طرح
میں بھی خوش رہنا چاہتا تھا ۔ ماں مجھے پیار دے سکتی تھی ، اس کے پاس اب
خوشی اور مسکراہٹ نہیں رہی تھی ۔ جوں جوں دن گزرتے گئے میرا سوتیلا باپ
گھر کا تھانیدار بنتا گیا ۔ حتیٰ کہ اُس نے مجھے بیٹے کی بجائے نوکر بنا لیا ۔ اگر مجھے
اس سے پیار مل جاتا اور اگر وہ میری ماں کو میرے باپ والی محبت دے دیتا

تو میں اس کے جوتے پالش کرنے، اس کا حقہ گرم کرنے اور بارش میں بھی بازار جا کر اس کی بتائی ہوئی چیزیں لانے میں خوشی محسوس کرتا . . . . .

"مجھے اس کی نوکری پسند نہ آئی تو میں نے ٹال مٹول شروع کر دی۔ پہلے تو اس نے گالیاں دیں، پھر مجھے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ اس وقت میں ساتویں جماعت میں تھا۔ پڑھائی میں میں اچھا ہوا کرتا تھا۔ بُرے سلوک کے اثر سے یہ دلچسپی ختم ہو گئی۔ میری دوستی اُن چار لڑکوں کے ساتھ ہو گئی جو ہنستے کھیلتے اور خوش رہتے تھے۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ کلاس میں سب سے زیادہ نالائق اور کُند ذہن ہیں۔ ان میں دو امیر والدین کے بیٹے تھے۔ میرے پاس کبھی کبھی ایک یا دو پیسے ہوتے تھے۔ ان کے پاس ہر روز تین تین چار چار پیسے ہوتے تھے۔ ہم شرارتیں کرتے اور دل بہلاتے۔ پھر ہم کلاس سے غائب بھی ہونے لگے۔ ماسٹر پٹائی کرتا تھا۔ گھر میں سوتیلا باپ کسی نہ کسی وجہ سے پٹائی کر دیا کرتا تھا۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ انسان ہر سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ میں پٹائی کا عادی ہو گیا اور آپ یقین کریں کہ مجھے پٹائی میں بھی لُطف محسوس ہونے لگا۔ گھر سے میں زیادہ سے زیادہ دیر غائب رہنے لگا۔ انہی چار دوستوں کے ساتھ وقت گزرتا تھا۔ ان میں دو تو امیر گھرانوں کے تھے اور دو میری طرح گھروں سے نالاں دل بہلانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ یہ دونوں تاش کھیلنا جانتے تھے۔ ان سے میں نے بھی تاش سیکھ لی، اور انہوں نے مجھے چوری بھی سکھا دی . . . . .

"مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک چھابڑی والے سے ہم چاروں کچھ لے رہے تھے۔ چھابڑی والے کے ہاتھ میں کچھ پیسے تھے جن میں سے ایک اٹھنی نیچے گر پڑی۔ اُسے شاید پتہ نہ چلا۔ ہم میں سے کسی نے بھی اُسے نہ بتایا کہ اُس کی ایک اٹھنی نیچے گر پڑی ہے۔ اُسے اس نقصان کا علم ہو گیا تھا۔ وہ بار بار پیسے گنتا تھا۔ میرے ایک دوست نے اٹھنی پر پاؤں رکھ لیا۔ اس

کے پاؤں میں جوتا نہیں تھا۔ ہم وہاں سے ہٹ کر دور گئے تو میرے ایک دوست نے کہا کہ اس کی اٹھنی ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ اگر وہ وہاں سے چلا جاتا تو اٹھنی ہم اٹھا لیتے۔ میرے جس دوست نے اٹھنی پر پاؤں رکھا تھا، اُس نے جُھک کر اپنے پاؤں کی انگلیوں کے نیچے سے اٹھنی نکال کر ہمیں دکھائی بولا ——— 'یہ رہا خزانہ۔ بولو کیا کھلاؤں'——— اُس زمانے میں آٹھ آنے خاصی رقم سمجھی جاتی تھی۔ ہم چاروں نے آٹھ آنے چند منٹوں میں خرچ کر ڈالے۔ اس طرح ہمیں چوری کے فائدے معلوم ہو گئے . . .

"میں اُس وقت آٹھویں جماعت میں تھا جب میں نے گھر میں پہلی چوری کی۔ یہ صرف دو آنے کی چوری تھی۔ سوتیلے باپ کو بھی پتہ نہ چلا اور ماں کو بھی محسوس نہ ہوا۔ میں نے پیسے اڑانے کا ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا کہ کوئی چیز بازار سے لانے کے لیے مجھے بھیجا جاتا تو میں دو چار پیسے اُڑا لیتا تھا۔ انہی دنوں میری ماں نے میرے سوتیلے باپ کے پہلے بچے کو جنم دیا۔ محلے کی عورتیں آتی تھیں تو میری ماں کو مبارک کا ایک روپیہ یا آٹھ آنے دے جاتی تھیں۔ ماں یہ پیسے اپنے سرہانے کے نیچے رکھ دیتی تھی۔ میں نے ایک روز بچے کے ساتھ کھیلتے کھیلتے ایک ہاتھ سرہانے کے نیچے سرکا دیا اور ایک روپیہ کھسکا لیا۔ رات کو ماں پیسے گنتے گنتے پریشان ہو گئی — اس نے عورتوں کا حساب کیا پھر پیسے گنے۔ ایک روپیہ کم تھا، مگر وہ خاموش رہی۔ میں نے دوسرے دن اپنے دوستوں کی دعوت کی اور سگریٹ کا پہلا کش لگایا . . . .

"ایک روز ماسٹر نے ساری کلاس سے فیس لی اور رقم میز کی دراز میں رکھ دی۔ تفریح کا وقت ہو گیا۔ ماسٹر باہر نکل گیا اور لڑکے بھی باہر کو بھاگ گئے۔ میں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ ماسٹر کے دراز میں سے چھ آنے اُڑا لیے۔ وہاں بہت سے پیسے تھے۔ ہم سب پر ہاتھ صاف نہیں کر سکتے تھے۔ باہر جا کر چھ آنے زمین میں دبا دیئے۔ ماسٹر فیس جمع کرانے گیا تو پریشانی کے

عالم میں واپس آیا - ساری کلاس کی جیبیں دیکھیں - بستے کھول کر دیکھے، مگر اُسے چور نہ مل سکا.....

"اس چوری کے بعد ہم نے تاش سے جُوا کھیلنا شروع کر دیا - جُوئے اور چوری کا چولی دامن کا ساتھ ہے - پھر جُوا بھی چلتا رہا اور چوری چکاری کا سلسلہ بھی - ان گناہوں میں مجھے لطف سا محسُوس ہوتا تھا - اپنے باپ نے جس طرح مجھے آسمان سے زمین پر پھینکا تھا اور سوتیلا باپ مجھ پر جو ظلم کرتا تھا اس کی تلخی ختم ہو جاتی تھی - یہ تو مجھے بڑے ہو کر پتہ چلا ہے کہ پیار سے محروم اور ظلم و ستم کے شکار بچوں میں قدرتی طور پر یہ بُری عادتیں پیدا ہوتی ہیں - جب مَیں چھوٹا تھا تو یہی احساس تھا کہ میری گمشدہ خوشیاں اور مجھ سے چھینا ہوا پیار انہی گناہوں میں مجھے واپس مل گیا ہے.....

"میں اگر چوری کی تمام وارداتیں سنانے لگوں تو میری آپ بیتی دو دنوں میں بھی ختم نہیں ہو گی - میں بتانا صرف یہ چاہتا ہوں کہ جس گھر میں والدین میں گڑبڑ ہو جائے، طلاق ہو جائے، باپ سوتیلا مل جائے، وہاں بچوں کا کیا حال ہوتا ہے - میں دسویں جماعت تک پہنچ گیا لیکن میرے چاروں دوست پیچھے رہ گئے - دو نے سکول چھوڑ دیا - دو فیل ہوتے رہے لیکن ہماری دوستی قائم رہی - اس وقت تک میں تجربہ کار جواری بن چکا تھا - گھر میں میرے سوتیلے باپ کا دوسرا بچہ پیدا ہو چکا تھا.....

"سوتیلے باپ کو اپنے بچوں کے ساتھ بہت پیار تھا اور میں اس کا نوکر تھا - وہ جب اپنے بچوں کے ساتھ پیار کرتا تھا تو میرا دل انگارے کی طرح جلنے لگتا تھا - اپنی ماں کو تو میں پہچان بھی نہیں سکتا تھا - میرے سگے باپ کے گھر وہ ایک زندہ دل عورت تھی - وہاں بادشاہی کرتی تھی - دوسرے خاوند کے گھر وہ ایسا درخت بن گئی تھی جس کا ایک بھی پتا ہرا نہیں رہا تھا - میری عادتوں کی وجہ سے وہ میرے ساتھ ناراض رہتی تھی - میری بہن بھی ہر وقت اداس

رہتی تھی.....

"چند اور لڑکوں کو بھی ہم نے جُوئے کا عادی بنا دیا تھا - ایک رات ہم نے ایک ہندو کی دکان کا تالا توڑ کر کچھ سامان چُرایا اور ایک مسلمان دکاندار کے پاس بہت سستا بیچ دیا - میں نے دسویں کا امتحان نہ دیا - عمر سولہ سال سے اوپر ہو گئی تھی - مجھ جیسے گمراہ لڑکوں میں جنسی بدی پیدا ہونا قدرتی عمل ہوتا ہے - یہ بدی مجھ میں اور میرے دوستوں میں بھی پیدا ہوئی - ہم نے بیہودہ غلیظ اور شرمناک حرکت کی جس کا آپ تصوّر کر سکتے ہیں - بھکاری لڑکیوں کو ہم نے چوری کے پیسوں سے خراب کیا - فلمیں دیکھ کر عشق و محبت کا کھیل کھیلا - بدکاری کے اڈے تک پہنچے اور ہم گناہوں میں ڈوب گئے - مجھے اس کی بالکل پرواہ نہیں تھی کہ محلے کے اور اردگرد کے لوگ ہمیں غنڈے اور بدمعاش کہتے ہیں - لڑائی مول لینا ہمارا معمول بن گیا تھا - مجھے بالکل یاد نہ رہا کہ اپنے سگے باپ کے گھر میں مجھے لوگ کتنا ذہین بچہ کہتے تھے اور سکول میں میرا کتنا نام تھا.....

"۱۹۴۶ء کا دسمبر تھا - فلموں نے مجھ پر یہ اثر کیا کہ ہیرو بننے کا بھوت سوار ہو گیا - اپنے ایک امیر گھرانے کے دوست کو تیار کیا کہ بمبئی چلتے ہیں - بمبئی فلموں کا گڑھ تھا - پروگرام بناتے بناتے خیال آیا کہ لاہور میں بھی فلم کمپنیاں ہیں - اُن دنوں لاہور کی پنچولی آرٹ فلم کمپنی کی شہرت تھی - میں نے اس کمپنی کی پنجابی فلمیں دیکھی تھیں - ایک روز ہم دونو بغیر ٹکٹ گاڑی میں بیٹھے اور لاہور پہنچ گئے - ہم دونوں نے اپنے اپنے گھروں سے پیسے چوری کیے تھے - لاہور ریلوے سٹیشن سے ہم گیٹ سے نہ نکلے - ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ بادامی باغ کی طرف چلے گئے اور شہر میں داخل ہو گئے - پوچھتے پوچھتے پنچولی آرٹ سٹوڈیو پہنچ گئے مگر اندر کسی نے نہ جانے دیا - باہر کھڑے رہے - راگنی دیکھی - اُن دنوں راگنی جوان تھی اور بہت خوب صورت ایکٹرس تھی - مجھے ایک اور ایکٹرس بہت

پسند تھی جس کا نام رمولا تھا۔ اُسے بھی دیکھا۔ گیٹ پر ہم جیسے چند اور نوجوان کھڑے تھے۔ وہ سب ہیرو بننے آئے تھے۔ ہم سارا دن وہاں کھڑے رہے اور شام کو مایوس ہو کر شہر چلے گئے......

"رات ریلوے سٹیشن کے مسافر خانے میں سردی میں ٹھٹھرتے گزاری۔ دوسرے دن دھوپ نکلی تو خدا کا شکر ادا کیا۔ کچھ کھا پی کر پھر پنچولی کے سٹوڈیو جا پہنچے۔ اندر جانے کی کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ چوکیدار پٹھان تھا۔ اُسے بتایا کہ ہم فلم میں کام کرنے آئے ہیں۔ اُس نے بتایا کہ روزانہ آجایا کرو۔ ایکسٹرا کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ شاید تمہاری باری بھی آجائے۔ ہم نے پوچھا کہ ایکسٹرا کیا ہوتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ بعض فلموں میں بہت سے آدمیوں کا ہجوم دکھایا جاتا ہے یا بازار کے منظر میں چند آدمی چلتے پھرتے دکھاتے ہیں۔ اس ہجوم میں تمہیں بھی شامل کرلیں گے۔ میں نے پوچھا کہ پیسے کتنے دیں گے؟ اس نے بتایا کہ ڈیڑھ دو روپے دے دیں گے۔ میرے دوست نے ذرا جھجک کر پوچھا ——— "ہم اگر ہیرو بننا چاہیں تو کس سے ملیں"؟ ——— پٹھان نے پہلے تو ہم دونوں کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر اُس نے ہنسنا شروع کر دیا......

"وہ ہنس رہا تھا اور ہم اُسے دیکھ رہے تھے کہ اتنے میں میرا سب سے زیادہ پسندیدہ ایکٹر، ایم۔ اسماعیل مرحوم، سٹوڈیو سے باہر آتا دکھائی دیا۔ پٹھان نے ہماری طرف اشارہ کر کے ایم۔ اسماعیل سے کہا ——— "یہ دو ہیرو آئے ہیں" ——— اور وہ پھر ہنسنے لگا۔ ایم۔ اسماعیل نے ہم سے پوچھا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں۔ ہم نے بتایا تو وہ ہمیں اپنے ساتھ لے گیا لیکن سٹوڈیو کے اندر نہیں، باہر سڑک کی طرف۔ وہ بہت سنجیدگی کے عالم میں تھا اور خاموش۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ وہ ایک جگہ دھوپ میں رُک گیا اور ہم سے پوچھا ——— "مسلمان ہو یا ہندو"؟ ——— ہم نے بتایا کہ مسلمان ہیں تو اُس نے پوچھا ——— "کہاں تک پڑھے ہو"؟ ——— ہم نے صاف بتا دیا کہ دسویں جماعت کا امتحان نہیں دیا اور پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ میرے دوست نے بھی ایسا ہی جواب دیا......

"میں اُس وقت تک ایم۔ اسماعیل کو صرف ایکٹر سمجھتا تھا۔ اُس نے جس دلچسپی سے ہمارے متعلق پوچھا اس سے ہم خوش ہوئے کہ ہمیں مسلمان سمجھ کر وہ ہمیں ہیرو کا رول دے دے گا، لیکن اس نے ہمیں جو لیکچر دینا شروع کیا تو مجھے شک ہونے لگا کہ یہ وہ ایم اسماعیل نہیں جو میرا پسندیدہ ایکٹر ہے۔ یہ کوئی صاحب کردار مسلمان ہے جو کسی مسلمان لڑکے کو آوارگی کی حالت میں دیکھنا برداشت نہیں کر سکتا۔ اُس نے ہمیں جو کچھ کہا وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ فوراً اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔ اپنے والدین سے معافی مانگو اور جن کلاسوں سے تم بھاگے تھے، ان میں داخل ہو جاؤ۔ پھر مسجد میں جاؤ اور خدا سے گناہوں کی معافی مانگو۔ تم اگر ہندو ہوتے تو میں تمہیں سٹوڈیو کے اندر لے جاتا اور ایکسٹرا کے رول دلا کر تمہاری ساری عمر تباہ کر دیتا۔ اندر جا کر دیکھو۔ تمہارے جیسے نوجوان یہاں بوڑھے ہو رہے ہیں۔ انہیں دو روپے روزانہ سے زیادہ کچھ نہیں ملتا۔ پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں کے پاؤں میں بیٹھے رہتے ہیں۔ کنجروں کی دلالی کرتے ہیں۔ وہ سب ہیرو بننے آئے تھے....

"اُس نے کہا کہ تم جیسے مسلمان لڑکے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں، پولیس کی لاٹھیوں سے زخمی ہو رہے ہیں، گولیوں سے شہید ہو رہے ہیں، گرفتار ہو رہے ہیں، انگریزوں کی بادشاہی کے خلاف انہوں نے ایسی بغاوت کی ہے کہ ہمیں پاکستان صاف نظر آرہا ہے اور تم اس کنجر خانے میں ہیرو بننے آگئے ہو۔ تم مال روڈ پر جاؤ۔ وہاں دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ تم اخبار نہیں پڑھتے؟ قائداعظم محمد علی جناح کا نام نہیں سنا؟ اپنے خدا اور اپنے رسولؐ کو بھی نہیں جانتے؟...... اگر تم اس جہاد میں شامل نہیں ہونا چاہتے تو گھروں کو چلے

جاؤ اور پڑھو لکھو......

"میں نے اس کی باتیں بہت ہی مختصر سنائی ہیں۔ وہ عجیب سی روانی سے بول رہا تھا۔ میرے آنسو نکل آئے۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں کس کا بیٹا ہوں اور میرے ساتھ کیا گزری ہے۔ میرے دل میں جو کچھ بھی تھا اس کے آگے اگل دیا۔ اس سلسلے میں بھی اُس نے بہت سی باتیں کیں لیکن میرا دل اس کی اس نصیحت کو ماننے پر راضی نہ ہوا کہ میں اپنے سوتیلے باپ سے معافی مانگ لوں۔ میں نے اس کی باقی باتیں قبول کر لیں اور ہم دونوں دوست وہاں سے آ گئے۔ ایک تو عمر ایسی تھی جو عقل کی بات کو تسلیم نہیں کیا کرتی اور میرا دماغ کسی اور راستے پر جا رہا تھا، اس لیے ایم۔ اسماعیل کی بہت سی اچھی باتیں دل سے اُتر گئیں۔ دل نے صرف یہ قبول کیا کہ فلم کا ہیرو بننا آسان کام نہیں۔ میں نے اس بات کو تو غور سے سنا ہی نہیں کہ مجھ جیسے نوجوان آزادی کے لیے جہاد کر رہے ہیں۔ مجھے قائداعظم کے ساتھ بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں صرف نام کا مسلمان تھا۔ میرے لیے ہندوستان اور پاکستان کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے......

"ہم دو تین روز لاہور کی سیر کرتے رہے اور راتیں اِدھر اُدھر گزارتے رہے۔ ہم گھروں کو واپس جانے سے اس لیے ڈرتے تھے کہ ہم پیسے چرا کر لائے تھے۔ خاص طور پر مجھے ڈر زیادہ تھا کیونکہ میرا باپ سوتیلا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے پولیس کے حوالے کرنے کے لیے اسے معقول بہانہ مل گیا ہے، اس لیے وہ مجھے کبھی نہیں بخشے گا۔ میرا دوست لاہور میں ذلیل و خوار ہونے سے گھبرا گیا تھا۔ کہتا تھا کہ واپس چلتے ہیں۔ میں نے اُسے قائل کر لیا کہ فلم میں کام لینے کی ایک اور کوشش کریں گے......

"ہم نے لاہور میں تین فلمیں دیکھیں۔ ان کے اثر سے ہیرو بننے کا کیڑا دماغ میں پھر سے کلبلانے لگا۔ گھروں سے چرائے ہوئے پیسے ختم ہو گئے.... ہم

ایک بار پھر وہیں جا پہنچے جہاں سے ایم۔ اسماعیل نے ہمیں واپس بھیجا تھا۔ ہم ڈرتے تھے کہ ایم۔ اسماعیل نہ دیکھ لے۔ وہاں ایک آدمی سے ملاقات ہو گئی۔ اُس نے خود ہی پوچھا کہ ہم سیر سپاٹے کے لیے آئے ہیں یا فلم میں کام کرنے۔ ہم نے اپنا ارادہ بتایا تو اُس نے نہایت دلکش باتوں میں ہمیں ہیرو بنا دیا۔ اس نے کہا کہ ابتدا میں وہ ہمیں چھوٹے چھوٹے رول دلائے گا پھر بڑے رول اور اس کے بعد ہیرو یا ولن کا رول مل جائے گا.....

"یہ تو بہت عرصے بعد کی بات ہے کہ ہمیں پتہ چلا کہ اس قسم کے آدمی ہر فلم سٹوڈیو کے اردگرد، اور آج کل لاہور کے رائل پارک میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ یہ ایکسٹرا سپلائی کرنے والے ٹھیکیدار ہوتے ہیں جو مجھ جیسے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو چکنی چپڑی باتوں سے پھانس کر فلموں میں سپلائی کرتے اور پیسے کماتے ہیں۔ لڑکیوں کو وہ عصمت فروشی کے لیے بھی سپلائی کرتے اور خوب روپیہ بٹورتے ہیں۔ نوجوانی کے دور میں ہم اس کی باتوں میں آ گئے۔ ہم نے تقاضا کیا کہ وہ ہمیں کوئی بڑا رول دلائے۔ اس نے کہا کہ یہاں رشوت بھی چلتی ہے۔ تم ایک ایک سو روپیہ دو تو وہ ایک ڈائرکٹر کو دے کر بڑا رول دلا دے گا۔ ہمارے پاس سو پیسے بھی نہیں تھے۔ اُس شام کے کھانے کے لیے بھی پیسے پورے نہیں تھے مگر اپنے ارادے اور خواہش کی تکمیل کے لیے دو سو روپیہ کہیں نہ کہیں سے حاصل کرنا ضروری سمجھا۔ ہم نے اُسے بتایا کہ ہم رقم لے کر آئیں تو اُسے کہاں ملیں۔ اس نے بتایا کہ وہ جب بھی آئیں اسی جگہ ملیں۔ اس نے ہمیں ایک کینٹین دکھائی اور کہا کہ اس کے مالک کو میرا نام بتانا۔ وہ مجھے بلا لے گا.....

"ظاہر ہے کہ ہمیں دو سو روپے کہیں سے چوری کرنے تھے۔ میں یہ بات خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ نوجوانی کی عمر میں انسان [illegible] اسماعیل جیسی اچھی باتیں قبول کرنے کی بجائے اس ٹھیکیدار جیسی غلط باتیں زیادہ پسند کرتا

ہے۔ یہی چیز تباہی کا باعث بنتی ہے۔ ہم دونو بھی اس کی باتوں میں آگئے اور کہیں چوری کرنے کی سکیم بنانے لگے۔ میرا دوست پہلے سے زیادہ گھبرا رہا تھا......

"شام کو ہم نے ایک نانبائی کے تنور سے ایک ایک روٹی اور دال کھائی اور پیسے بالکل ہی ختم ہو گئے۔ میں نے دن کے وقت دکانوں اور محلّوں میں گھومنا پھرنا شروع کر دیا۔ میں جائزہ لے رہا تھا کہ چوری کہاں کی جاسکتی ہے میں چوری سے ڈرنے والا نہیں تھا۔ اُس وقت تک کئی چوریاں کر چکا تھا...

"میں چار روز پھرتا رہا۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ یہ چار روز ہم نے نلکے کے پانی کے سوا کچھ پیا نہیں اور کچھ کھایا نہیں؟ جسم کے ساتھ دماغ بھی جواب دے گیا۔ اب دو سو روپیہ تو بعد کا مسئلہ تھا، پیٹ میں کچھ ڈالنے کا مسئلہ سامنے آگیا.....

"چوتھے روز میرا دوست مجھ سے لڑ پڑا۔ اتنی زیادہ فاقہ کشی میں غصہ بہت آتا ہے۔ میں نے اُسے کھانے کی ایک ترکیب بتائی۔ شام کو میں اُسے ایک نانبائی کے تنور پر لے گیا۔ چار روٹیاں اور دال لی۔ ہم نے زمین پر بیٹھ کر یہ کھانا کھایا۔ پانی پیا اور دوست کو اشارہ کیا۔ ہم دونوں اُٹھے اور دوڑ پڑے۔ تھوڑی دور تک نانبائی کی آوازیں سنائی دیں —— "اوئے پیسے اوئے پیسے" —— اُس نے گالیاں بھی دیں مگر ہمارے پیچھے کوئی نہ آیا۔ ہم دُور نکل گئے۔ روٹی نے جسم میں جان ڈال دی۔ رات ریلوے سٹیشن کے مسافر خانے میں چلے گئے.....

"ہم نے سوچا کہ ایسے کب تک گزارہ ہو گا۔ پیسوں کا انتظام ایک آدھ دن میں ہونا چاہیے۔ میں نے چوریاں تو بہت کی تھیں لیکن میں تجربہ کار چور یا ڈکیت نہیں تھا۔ صرف اس ارادے نے مجھے حوصلہ دیا کہ مجھے چوری کی واردات کرنی ہے۔ مجھے ہزاروں روپوں کی نہیں، زیادہ سے زیادہ اڑھائی سو روپے کی ضرورت

تھی۔ دو سو روپے اس آدمی کو دینے کے لیے اور پچاس روپے کھانے پینے کے لیے......

"میں نے اندرون لاہور کی ایک گلی اور ایک مکان کی بالائی منزل دیکھی تھی۔ سیڑھیاں بھی دیکھیں اور ایک سکیم تیار کی تھی۔ میرا دوست مسافر خانے کے ایک بنچ پر سو گیا۔ ۱۹۴۷ء کا سال شروع ہو چکا تھا۔ سردی کڑاکے کی تھی۔ میں دوست کو بتائے بغیر چوری کی واردات کرنے چل پڑا.....

"آج جب تنہائی میں وہ وقت یاد آتا ہے تو حلق میں کوئی چیز اٹک جاتی ہے۔ بے چین ہو جاتا ہوں اور جب تک آنسو نہ بہ جائیں چین نہیں آتا۔ میری خوشیاں چھ سال پیچھے رہ گئی تھیں۔ میرا باپ زندہ تھا۔ ماں زندہ تھی مگر اُن کا لاڈلا بیٹا مر گیا تھا جس کا نام ارشاد ہوا کرتا تھا جبل پور کے ایک فوجی بنگلے میں شہزادوں کی طرح رہنے والے ارشاد کی بدروح لاہور ریلوے سٹیشن کے تھرڈ کلاس مسافر خانے میں بھٹک رہی تھی۔ اُس وقت میرا باپ اپنی دوسری اور جوان بیوی کے ساتھ افسروں کے میس میں شراب پی رہا ہو گا اور میری ماں دوسرے اور ظالم خاوند کے گھر میں مشقت کے مارے ہوئے قیدی کی طرح پڑی سو رہی ہو گی —— اور اس وقت اُن کا بچہ کسی کا گھر لوٹنے کے لیے جا رہا تھا......

"میں اُسی گلی میں چلا گیا جو میں نے چوری کے لیے منتخب کی تھی۔ اندھیرا تھا۔ آدھی رات سے بہت پہلے کا وقت تھا۔ گلی سنسان پڑی تھی۔ مجھے ایک مکان کی سیڑھیوں پر چڑھنا اور ایک کمرے میں داخل ہونا تھا۔ کسی کو ڈرانے کے لیے میرے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ مجھے خالی ہاتھوں اور زبان سے کام لینا تھا۔ اُن دنوں شہر میں سیاسی ہنگامے روزمرہ کا معمول تھا۔ اس لیے لوگ شام کو ہی گھروں میں دبک جاتے تھے۔ مسلمانوں کے جلوس ہر روز نکلتے اور ہندو مسلم فساد کی فضا بنی رہتی تھی۔ میں مسلمانوں کی ان سرگرمیوں سے بے نیاز تھا اور

گلی میں آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ اس مکان سے میں تین چار مکان دُور تھا جب مجھے کسی کے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ پیچھے سے کوئی آ رہا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو مجھے کوئی فکر نہ ہوتی۔ ڈر پولیس کا تھا۔ رات کو پولیس کے دو دو سپاہی سڑکوں پر گشت کیا کرتے تھے.....

"میرے بائیں ہاتھ ایک مکان کا بڑا دروازہ تھا جس کی تین چار سیڑھیاں تھیں۔ میں ان پر چڑھ گیا اور کونے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ قدموں کی آواز قریب آ گئی۔ باتوں کی آوازوں میں ایک آواز عورت کی تھی۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ وہ میرے سامنے سے گزرے اور تین چار قدم آگے جا کر رک گئے۔ اندھیرے میں وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مجھے وہ سیاہ سائے سے نظر آ رہے تھے۔ ان کی عمروں اور شکلوں کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ آواز سے عورت جوان معلوم ہوتی تھی۔ اس نے کہا —— "تم اب چلے جاؤ۔ کل وہیں ملاقات ہو گی" ——

ایک آدمی نے کہا —— "تمہارے امّی ابّا جاگ رہے ہوں گے"۔ لڑکی نے جواب دیا —— "تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میں اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤں گی" —— لڑکی ہنس پڑی۔ پھر خدا حافظ کے الفاظ سنائی دیئے۔ لڑکی آگے چلی گئی اور دونوں آدمی واپس چل پڑے.....

"ایک آدھ منٹ میں آدمیوں کے قدم خاموش ہو گئے۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ گلی کا موڑ مڑ گئے ہیں۔ میں اٹھ کر گلی میں گیا۔ لڑکی ایک سائے کی طرح مجھے آگے ایک دروازے میں داخل ہوتی نظر آئی۔ میرے دماغ نے بجلی کے کرنٹ کی طرح سوچ لیا کہ یہ لڑکی ان آدمیوں کے ساتھ عیش کر کے آئی ہے۔ اس کے پاس پرس ہو گا۔ پرس میں کافی پیسے ہوں گے اور اس نے زیور بھی پہن رکھا ہو گا۔ گلے میں ہار تو ضرور ہو گا۔ وہ نہیں تو ایک انگوٹھی ضرور ہو گی۔ یہ ان آدمیوں کے ساتھ چوری چھپے گئی تھی۔ آوارہ اور عیاش ہو گی۔ اسی لیے اس نے امّی اور ابّا کے جاگنے کی پروا نہیں کی تھی اور کہا تھا کہ اپنے کمرے میں جا

کر سو جاؤں گی۔ اس بے پروائی سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ آزاد اور امیر گھرانے کی لڑکی ہے۔ میں اسے بلیک میل کر سکتا تھا.....

"یہ سارے خیال ایک سیکنڈ میں میرے دماغ میں آئے اور میں اس کے پیچھے چلا گیا۔ وہ جس دروازے میں داخل ہوئی تھی وہ ایک چوڑا دروازہ تھا اور کھلا ہوا تھا۔ مجھے سیڑھیوں پر قدموں کی آواز سُنائی دی۔ میں نے کہا —— "ذرا ٹھہرنا" —— قدم رک گئے۔ میں دروازے میں کھڑا تھا۔ وہ نیچے آتے ہوئے بولی —— "کیوں؟ کیا بات ہے؟ کچھ اور یاد آ گیا ہے؟" وہ بھی شاید میں اس کے دوستوں میں سے ایک ہوں۔ میں نے کہا —— "ہاں ایک ضروری بات یاد آ گئی ہے" —— وہ میرے قریب آ گئی اور ذرا حیران سی ہو کے کہنے لگی —— "اوہ۔ تم تو کوئی اور ہو" —— میں نے کہا —— "ہاں، میں کوئی اور ہوں لیکن ڈرو نہیں۔ میں تمہیں اٹھا نہیں لے جاؤں گا۔ تم سے ایک قدم دُور کھڑا رہوں گا".....

"وہ بالکل خاموش کھڑی رہی۔ میں نے کہا —— "تمہارے پاس جتنے پیسے ہیں وہ مجھے دے دو اور سونے کی جو جو چیز تم نے پہن رکھی ہے وہ بھی اتار دو اور جاؤ".....

"اس نے کہا —— "مجھے تم سے ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ میرے پاس کوئی پیسہ نہیں۔ سونے کی صرف ایک انگوٹھی ہے جو میں تمہیں نہیں دوں گی".....

"میں اس کی دلیری پر حیران ہوا۔ میں نے کہا —— "میں زیادہ بحث نہیں کروں گا۔ اونچی آواز نکالو گی تو قتل کر دوں گا۔ اگر تم سے کچھ نہ ملا تو اوپر جا کر تمہارا گھر لوٹ لوں گا".....

"مجھے اپنے پیچھے گلی میں سے آواز سنائی دی —— "کون ہے یہ فوزیہ؟" —— میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ وہ دونوں آدمی کھڑے تھے

جو اس کے ساتھ آئے اور چلے گئے تھے۔ لڑکی نے ہنس کر کہا ــــ "رہزن ہے۔ کہتا ہے پیسے اور زیورات دے دو ورنہ قتل کر دوں گا"۔۔۔۔

"میں کچا چور تھا۔ ایسے لگا جیسے جسم خون سے خالی ہو گیا ہے۔ میں ابھی کچھ سوچ بھی نہ سکا تھا کہ کیا کروں کہ ان دونوں نے مجھے جکڑ لیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں پکڑا گیا تھا۔ مجھے اب پولیس کے پاس پھر جیل خانے میں جانا تھا۔ میں نے ان سے آزاد ہونے کی کوشش کرنے کی بجائے ان کی منت سماجت شروع کر دی کہ مجھے چھوڑ دیں اور میں آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔ انہوں نے تھانے چلنے کو کہا تو میں نے چھوٹے سے بچے کی طرح ڈرے اور روتے ہوئے لہجے میں انہیں خدا کے واسطے دیئے اور ہاتھ جوڑ کر کہا کہ اونچا نہ بولیں ورنہ محلے والے باہر نکل آئیں گے۔ میری ساری غنڈہ گردی اور بدمعاشی ختم ہو گئی۔ ہیرو بھی مر گیا۔ میں نے کہا کہ مجھے بھوک نے یہ جرم کرنے پر مجبور کیا ہے۔

"وہ شاید سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کوئی پیشہ ور رہزن نہیں ہوں اور شوقیہ وارداتیں کرتا ہوں۔ ان میں سے ایک نے پوچھا ــــ "ہندو ہو یا مسلمان؟" ــــ میں نے بتایا کہ میں مسلمان ہوں۔ لڑکی نے کہا ــــ "اسے اوپر لے چلو۔ میں اسے روشنی میں دیکھوں گی۔ کمبخت مسلمان ہو کر چوریاں کرتا ہے"۔۔۔۔

"میں سمجھا کہ یہ لڑکی طوائف ہے جو اپنے والدین سے بھی نہیں ڈرتی اور اب کہتی ہے کہ اسے اوپر لے چلو۔ اس سے میں اور ڈرا کہ یہ مجھے خوب ماریں پیٹیں گے پھر پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ ایک آدمی نے کہا ــــ "ہم اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ تم جاؤ"۔ لڑکی نے ان سے پوچھا کہ تم دونو واپس کس طرح آ گئے تھے؟ انہوں نے بتایا کہ وہ آگے جا کر رک گئے تھے۔ وہ یہ یقین کر کے کہ لڑکی اپنے گھر میں داخل ہو گئی ہے واپس جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک آدمی ادھر، لڑکی کے پیچھے چل پڑا ہے اور لڑکی کے دروازے

میں داخل ہو گیا ہے وہ واپس آ گئے۔۔۔۔

"میں نے ان کی پھر منت سماجت کی کہ مجھے پولیس کے حوالے نہ کریں۔ میں اس قدر بزدل ہو گیا تھا کہ میں نے بھاگنے کی کوشش ہی نہ کی، حالانکہ انہوں نے مجھے درمیان رکھا ہوا تھا، پکڑا ہوا نہیں تھا۔ ہم جب سڑک کی روشنی میں گئے تو میں نے دیکھا کہ وہ دونوں مجھ سے ڈیڑھ دو سال ہی بڑے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ کالج کے سٹوڈنٹ تھے اور دونوں تھرڈ ائیر میں تھے۔ انہوں نے مجھے بجلی کے کھمبے کے ساتھ کھڑا کر لیا۔ میں شکل وصورت سے کوئی ایسا ویسا نہیں لگتا تھا۔ میں امیر زمیندار گھرانے کا بیٹا تھا۔ میرے چہرے پر گناہوں کے اثرات بھی ہوں گے لیکن میری اصلیت بھی چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ ان لڑکوں نے مجھے پہلی بات یہ کہی کہ مجھے کوئی باعزت ذریعۂ معاش تلاش کرنا چاہیئے۔ پھر انہوں نے بالکل ایم۔ اسماعیل کی طرح مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں، کہاں کا رہنے والا ہوں اور میں کچھ پڑھا ہوا ہوں یا نہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ میری پوری کہانی سنیں اور یہ بھی کہا کہ کسی کو میرے گھر بھیج کر تصدیق کرا لیں۔۔۔۔

"میں نے اپنی ساری رام کہانی سنا دی اور کہا کہ میرا باپ میری ماں کو طلاق نہ دیتا تو آج میں بھی کالج میں ہوتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ فوج میں لیفٹیننٹ ہوتا اگر اور کچھ نہ ہوتا تو کم از کم چور نہ ہوتا اور فلمی ہیرو بننے کی خواہش لے کر اس حال تک نہ پہنچتا۔ میرے آنسوؤں نے میری کہانی کی تصدیق کر دی۔ ان لڑکوں نے ایسی دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا کہ میری زبان سے وہ باتیں بھی نکل گئیں جو مجھے معلوم بھی نہ تھا کہ میرے دل میں ہیں۔ یہ پیار اور محبت کی تشنگی کا اظہار تھا جو میرے ارادے کے بغیر ہی ہو گیا۔۔۔۔

"ان کے ساتھ باتیں کرتے میں نے محسوس کیا کہ میں پیار کی پیاس سے مرا جا رہا ہوں اور میں جس گمراہی میں پڑا ہوں یہ دراصل فرار ہے اور پیار کی تلاش ہے۔ میں ان لڑکوں کا احسان ساری عمر نہیں بھولوں گا۔ انہوں نے

میری باتوں پر یقین کر لیا اور مجھ سے پوچھا کہ میں گھر جانا چاہتا ہوں یا میرا کیا ارادہ ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ سوتیلا باپ مجھے پولیس کے حوالے کر دے گا اس لیے میں گھر جانے سے ڈرتا ہوں۔ اگر اُس نے مجھے بخش بھی دیا تو بھی مجھے وہاں سکون اور پیار نہیں ملے گا۔۔۔۔۔

"وہ وقت ایسا تھا کہ مسلمان کو مسلمان سے محبت تھی۔ اتفاق اور ہمدردی تھی۔ ان لڑکوں نے مجھے اپنا بھائی سمجھا۔ مجھ سے وعدہ لیا کہ اگر وہ مجھے پناہ میں رے لیں تو میں بھاگ نہیں جاؤں گا اور انہیں دھوکہ نہیں دوں گا۔ وہ میری باتوں سے متاثر اور میں ان کے سلوک سے متاثر ہوا۔ میرے لیے ان کی یہ نیکی معمولی نہیں تھی کہ مجھے اتنا خطرناک جرم کرتے پکڑ کر بھی انہوں نے مجھے پولیس کے حوالے نہ کیا۔ میری جذباتی حالت ایسی ہو گئی کہ میں یہ بھول ہی گیا کہ ریلوے سٹیشن کے مسافر خانے میں میرا ایک دوست سویا ہوا ہے۔

دونوں لڑکوں نے آپس میں طے کر لیا کہ مجھے اپنے گھر کون لے جائے گا۔ ایک لڑکا مجھے اپنے گھر لے چلا تو میرے دل میں خیال آیا کہ وہ کتنا بڑا خطرہ مول لے رہا ہے کہ ایک چور اچکے اور بدکردار شخص کو اپنے گھر لے جا رہا ہے۔۔۔۔۔

"وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے کچھ کھایا پیا ہے یا نہیں۔ میں نے اُسے بتایا تھا کہ میں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ ایک نانبائی کے تنور سے دال اور روٹیاں کھائیں اور پیسے دیئے بغیر بھاگ گئے تھے۔ اس سے مجھے اپنا دوست یاد آ گیا۔ میں نے بتایا کہ وہ مسافر خانے میں سویا ہوا ہے لیکن میں نے اس خواہش کا اظہار نہ کیا کہ اپنے دوست کو بلا لاؤں۔ اس لڑکے نے بھی میرے دوست کے متعلق کوئی بات نہ کی۔ اس کا گھر بہت بڑا تھا۔ جس کمرے میں مجھے لے جایا گیا تھا اس کے فرنیچر وغیرہ سے پتہ چلتا تھا کہ امیروں کا گھر ہے۔ لڑکے نے اپنا نام اکرام الحق بتایا۔ دوسرے کا نام کلیم اللہ تھا۔۔۔۔۔

"اکرام سے میں نے پوچھا کہ وہ لڑکی کون ہے؟ اس نے اُس کا نام فوزیہ بتایا اور کہا کہ وہ مسلم لیگ کی ورکر ہے اور یہ دونوں (اکرام اور کلیم) اسے گھر چھوڑنے گئے تھے۔ فوزیہ کا باپ معذور تھا۔ دس گیارہ سال گزرے اُسے ٹائیفائڈ ہوا تھا جس سے اس کا نیچے کا دھڑ مفلوج ہو گیا اور وہ عمر بھر کے لیے معذور ہو گیا۔ فوزیہ کی ماں زندہ تھی۔ ان کی واحد اولاد فوزیہ تھی۔ اس کے باپ کو تھوڑی سی پنشن ملتی تھی۔ فوزیہ سیکنڈ ایئر کی سٹوڈنٹ تھی۔ ماں سلائی کڑھائی سے کچھ کما لیتی تھی۔ اب کوئی ایک سال سے، جب سے سٹوڈنٹس فیڈریشن نے سیاسی سرگرمیاں شروع کیں اور مسلم لیگ کا دایاں بازو بنی تھی فوزیہ کو مسلم لیگ کی طرف سے وظیفہ مل رہا تھا۔۔۔۔۔

"اس نے پوری تفصیل سے سنایا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے لیے الگ ملک مانگ رہے ہیں اور اب وہ کس طرح تشدد آمیز مظاہروں پر اُتر آئے ہیں۔ اکرام نے بتایا کہ انگریز کے بنائے ہوئے قانون اور آئین کے مطابق مسلمانوں نے اسمبلیوں کے الیکشن جیت کر یہ حقیقت ثابت کر دی ہے کہ ہندوستان میں مسلمان ایک الگ قوم ہیں جس کا اپنا ایک مذہب اور کلچر ہے اور یہ بھی کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر مسلمان اپنی قومیت برقرار نہیں رکھ سکتا۔ ہندو اور مسلمان کی دشمنی محمد بن قاسم کی آمد سے پہلے کی ہے۔ محمد بن قاسم سے لے کر خاندانِ مغلیہ تک ہندو مسلمان کا محکوم رہا اور یہاں اسلام کو فروغ ملا۔ ہندو نے ہمیشہ اپنے مذہب اور اپنے کلچر کا تحفظ کیا اور یہ دونوں مذہب اس ملک میں ٹکراتے رہے۔ مغلیہ دور ختم ہوا۔ انگریز آ گئے — ہندوؤں نے انگریزوں کی غلامی قبول کر لی اور مسلمانوں کو ذلیل و خوار کرنے لگے۔ اکرام نے مجھے بتایا کہ کس طرح مسلمانوں نے انگریزوں کے ابتدائی دور میں آزادی کے لیے جنگ لڑی تھی۔ اُس نے ۱۸۵۷ء کے واقعات بھی سنائے۔ ہمیں نویں دسویں جماعت میں جو تاریخ پڑھائی گئی تھی، اس میں

۱۸۵۷ء کے جہاد کو غدر اور بغاوت کہا گیا تھا .....

"مجھے اکرام نے بتایا کہ جنہیں انگریز بغاوت اور غدر کے مجرم کہتے ہیں وہ جنگِ آزادی کے مجاہدین تھے۔ اب مسلمان ایک بار پھر انگریز کے خلاف 'باغی' ہو گئے تھے اور ہندو اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ انگریز پورے کا پورا ہندوستان اس کے حوالے کر کے چلا جائے۔ ۱۹۴۷ء کے آغاز میں انگریزوں کی نیّت بھی بے نقاب ہونے لگی تھی۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ ہندوستان ہندوؤں کے حوالے کر کے جانا چاہتے ہیں مثلاً پنجاب میں مسلمانوں یعنی مسلم لیگ کی وزارت بن جانی چاہیئے تھی لیکن یہاں انگریزوں نے اپنی خوشامدی (جسے اُس وقت ٹوڈی کہا جاتا تھا) پارٹی کی وزارت بنا ڈالی تھی۔ یہ یونینسٹ پارٹی تھی جس کا لیڈر خضر حیات ٹوانہ تھا۔ مسلمانوں نے اس غیر آئینی اقدام کے خلاف ایسی بغاوت شروع کر دی تھی جو مسلّح تو نہیں تھی لیکن مسلمان غیر مسلح ہو کر بھی جنگی سطح پر مظاہرے کر رہے تھے۔ اکرام نے مجھے اس کی بھی پوری تفصیل سنائی .....

"اُس نے مجھے کوئی نصیحت نہیں کی۔ مجھے شرم نہیں دلائی۔ اسے شاید نصیحت کرنی آتی ہی نہیں تھی۔ وہ میرا ہم عمر تھا۔ اس کے انداز میں جوش اور ولولہ تھا جو میرے خون کی گردش کو تیز کرتا رہا اور میں ایسے محسوس کرتا رہا جیسے میری رگوں میں برقی رَو داخل ہو رہی ہے یا فاسد خون نکل رہا ہے اور اس کی جگہ تازہ خون جا رہا ہے۔ اس نے ہنس کر کہا ——— 'میں تم سے زیادہ آوارہ اور اوباش تھا۔ ہمارے ساتھ کئی سٹوڈنٹ ایسے ہیں جو کالجوں میں ماں باپ کا صرف پیسہ اڑانے اور لڑکیوں کا شکار کھیلنے آئے تھے۔ میں نے اور کلیم نے تمہاری طرح چوری چکاری تو نہیں کی عیّاشی بہت کی ہے۔ آج نو دس مہینے ہو گئے ہیں، ہم نے کوئی فلم نہیں دیکھی حالانکہ ہم روزانہ فلم اس طرح دیکھا کرتے تھے جس طرح مولوی پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں....

"میں نے اس سے پوچھا ——— 'تمہیں اس جہاد کے راستے پر کس نے ڈالا تھا؟ تمہیں کوئی کامل پیر اُستاد مل گیا ہوگا ورنہ ایسی بُری عادتیں چھوٹا نہیں کرتیں' ——— اس نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا ——— 'خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ ہمیں کسی نے کوئی نصیحت نہیں کی تھی۔ ہم نے کسی مولوی اور خطیب کا خطبہ نہیں سنا تھا۔ حالات نے خود ہی ہمیں یاد دلا دیا ہے کہ ہم مسلمان کی نسل سے ہیں اور مسلمان غلام نہیں رہ سکتا۔ ہندوؤں نے ہمیں خود بتا دیا ہے کہ وہ اسلام کے بدترین دشمن ہیں اور وہ اس ملک سے اسلام کا صفایا کریں گے۔ ہاں! ہمیں ایک کامل پیر اُستاد مل گیا ہے جس کا نام محمد علی جناح ہے اور قوم اسے قائدِ اعظم کہتی ہے' ——— اس طرح کی کچھ باتیں کر کے اُس نے کہا ——— 'کل تم میرے ساتھ چلو گے تو تمہیں بھی یاد آ جائے گا کہ تمہاری اصلیت اور قومیت کیا ہے۔ تم خاندانی لڑکے ہو۔ تمہارے اوپر جھوٹا خول چڑھ گیا ہے جو اُتر جائے گا۔ کل یہ لڑکی بھی تمہیں ملے گی جسے تم لوٹنا چاہتے تھے۔ اسے جس رات دیر ہو جاتی ہے میں یا کلیم یا کوئی اور لڑکا اسے گھر تک چھوڑ آتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ایسی بہت سی لڑکیاں ہیں۔ ہم ان سب کی حفاظت کرتے ہیں.....

"میں بیان نہیں کر سکتا کہ وہ کوئی جادو تھا یا کوئی آسیب جس کا مجھ پر غلبہ ہو گیا تھا۔ اکرام کی باتیں تو سنجیدہ تھیں لیکن وہ کھلنڈرے لڑکوں کی طرح باتیں کرتا تھا جیسے زخمی ہونا، گرفتار ہونا اور مرنا ایک کھیل ہو۔ دوسرے دن میں بھی اس کھیل میں شامل ہو گیا۔ اکرام کے گھر صبح جو ناشتہ کیا تھا وہ بہت عرصے بعد مجھے نصیب ہوا تھا۔ وہ مجھے مسلم لیگ کے مرکزی دفتر میں لے گیا۔ وہاں سٹوڈنٹ جمع ہوتے رہتے۔ ان میں لڑکیاں بھی تھیں۔ کلیم بھی آ گیا تھا اور فوزیہ بھی آ گئی۔ میں نے اسے گذشتہ رات اندھیرے میں دیکھا تھا۔ اکرام اور کلیم تعارف نہ کراتے تو میں اسے پہچان نہ سکتا۔ میرے متعلق

اسے بتایا گیا کہ یہ ہے رات والا رہزن - یہ بات مذاق کے رنگ میں کہی گئی
تھی لیکن شرم کے مارے میرا پسینہ نکل آیا - فوزیہ نے نفرت یا ناپسندیدگی
کا ذرا سا بھی اظہار نہ کیا - اکرام نے اُسے شاید میرے متعلق پہلے ہی سب
کچھ بتا دیا تھا - وہ کوئی خوبصورت لڑکی نہیں تھی - امیر گھرانے کی بھی نہیں
تھی - واجبی سی شکل وصورت کی غریب سی لڑکی تھی لیکن ذہین، چُست اور
ہوشیار - اُس نے میرے ساتھ جب باتیں کیں تو میں سمجھ گیا کہ رات اس نے
مجھے یہ جو کہا تھا کہ میرے پاس کوئی پیسہ نہیں اور میرے پاس سونے کی ایک
انگوٹھی ہے جو میں تمہیں نہیں دوں گی تو یہ اُس نے کھوکھلی بات نہیں کی تھی-
وہ اکیلی میرا مقابلہ کر سکتی تھی .....

"میں نے وہاں اپنے ہم عمر اور اپنی عمر سے چھوٹے بے شمار نوجوان
اور کم عمر لڑکے دیکھے اور جب ان کا جوش وخروش اور جذبے کی بے تابیاں
دیکھیں تو مجھے اپنی ذات پر رونا آیا - مجھے شرم آئی کہ یہ بھی میری طرح کے لڑکے
ہیں مگر یہ کس راستے پر جا رہے ہیں اور میں کدھر نکل گیا تھا - اکرام نے ٹھیک
کہا تھا کہ کسی نے اُسے کوئی نصیحت نہیں کی تھی نہ کسی نے لیکچر دیا تھا - مجھے
بھی اب کسی کی نصیحت اور لیکچر کی ضرورت نہیں تھی - میں غنڈہ اور بدمعاش تھا -
میں نے دیکھا کہ انگریزوں کے خلاف لڑائی میں بھی غنڈہ گردی اور بدمعاشی کی
ضرورت ہے البتہ اس کی صورت کچھ اور تھی - میں پہلے ہی دن ان کم عمر
مجاہدوں میں گھُل مل گیا - میرا مسئلہ رہائش اور اخراجات کا تھا - مجھے آج
تک علم نہیں ہو سکا کہ مجھے جو ساٹھ روپے ماہوار اکرام سے ملتے تھے ، وہ
مسلم لیگ دیتی تھی یا اکرام - کلیم اور اُن کے دوست چندہ کر کے دیتے تھے -
میری رہائش کا انتظام چار لڑکوں کے ساتھ کر دیا گیا جو ایک کمرے میں رہتے
تھے - کھانا پینا انہی کے ساتھ تھا .....

"ہم نے جس طرح جلوس نکالے اور ان جلوسوں پر انگریزوں کی پولیس

نے جس طرح تشدد کیا وہ ایک الگ داستان ہے - میں یہ بتا دینا ضروری
سمجھتا ہوں کہ قوم کے نوجوان طبقے یعنی طالب علموں نے پاکستان کے نام
اور اللہ اور رسولؐ کے نام پر جس بہادری، خلوص اور عزم کے مظاہرے کیے
وہ ایک تاریخی ثبوت ہے کہ پاکستان ان لڑکوں اور لڑکیوں نے بنایا ہے اور
آج انہی کے بیٹے اور بیٹیاں پاکستان کو تباہی سے بچا سکتی ہیں - یہ تباہی
ہندوستان کی طرف سے آئے، خواہ پاکستان کے اندر سے اُٹھے، اس کا
مقابلہ صرف نوجوانوں کو کرنا ہے اور وہ کر کے دکھائیں گے - شاید یہی وجہ
ہے کہ ہمارے دشمن، کیا ہندوستانی اور کیا پاکستانی، قوم کی اسی قوت کو کئی
طریقوں سے کمزور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں - آج کے نوجوان طبقے
کو اپنے سیاست باز لیڈر بھی آپس میں لڑا رہے ہیں اور ہندوستانی ایجنٹ
بھی انہیں ذہنی عیاشی کے ذرائع مہیا کر کے تباہ کر رہے ہیں .....

"زیادہ ولولہ انگیز جلوس خواتین کے ہوتے تھے - پولیس نے انہیں بھی
نہیں بخشا - اُن پر لاٹھی چارج بھی کیا اور آنسو گیس بھی پھینکی - لڑکیاں بیہوش
ہو ہو کر گرتی اور اُٹھتی تھیں - ان لڑکیوں نے کئی ایک سرکاری عمارتوں سے
برطانیہ کے جھنڈے اُتار پھینکے اور اس کی جگہ سبز پرچم لہرائے - پھر فوج بھی
آ گئی - جسے گرفتار کیا جاتا تھا اُسے تھانے میں مار مار کر ادھ مؤا کر دیا جاتا
تھا - انگریز نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتا ہے - ہندو
انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے .....

"میں آپ کو ایک جلوس کا واقعہ سناتا ہوں - میں اپنی قوم کی سرگرمیوں
میں پوری طرح مگن ہو گیا تھا - اس دوران فوزیہ کے ساتھ کبھی کبھی ملاقات
ہو جاتی تھی جو سلام و دُعا، خیر خیریت اور مسکراہٹوں تک محدود ہوتی تھی -
مجھے یہ لڑکی اچھی لگتی تھی لیکن یہ چاہت کسی اور رنگ کی تھی .....

"ایک روز خواتین کا جلوس نکالا گیا - اس کی قیادت بیگم فیروز خان نون

کررہی تھیں۔ ہم بہت سے نوجوان مرد خواتین کی حفاظت کے لیے جلوس کے
ساتھ تھے لیکن سڑک کے دائیں بائیں اور کچھ دُور دُور بکھر کر جا رہے تھے۔
چیئرنگ کراس پر جلوس کو پولیس اور فوج نے روکا۔ لڑکیوں نے رُکنے
سے انکار کر دیا اور نعروں سے زمین و آسمان ہلا ڈالے۔ جلوس کو خبردار کیا
گیا کہ منتشر نہ ہوا تو لاٹھی چارج کیا جائے گا.....

"تھوڑی ہی دیر بعد آنسو گیس کے گولے پھینکے گئے۔ لاٹھی چارج ہوا۔
بعض لڑکیوں کے قریب گیس کے گولے پھٹے۔ پھیپھڑوں میں زیادہ گیس جانے
سے وہ بے ہوش ہوگئیں۔ چند ایک کے سروں پر لاٹھیاں پڑیں اور وہ
گریں۔ مجھے وہ منظر اچھی طرح یاد ہے۔ مال روڈ پر خواتین بے ہوش پڑی تھیں
جیسے لاشیں بکھری ہوئی ہوں۔ کئی لڑکیوں کو پولیس گھسیٹ گھسیٹ کر ٹرکوں
اور اپنی لاریوں میں پھینک رہی تھی۔ سڑک پر سبز دوپٹے بکھرے ہوئے تھے۔
یوں معلوم ہوتا تھا جیسے انگریز باؤلا ہو گیا ہو.....

"لڑکے گری ہوئی لڑکیوں کو اٹھانے کے لیے دوڑے تو ان پر بھی
لاٹھیاں برسائی گئیں۔ مجھے فوزیہ نظر آگئی۔ وہ کھانستی اور آنکھیں ملتی سڑک
سے فٹ پاتھ کی طرف آہستہ آہستہ آرہی تھی۔ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔
میں اس کی طرف دوڑا۔ وہ پہلے ہی گر پڑی۔ میں اُسے اٹھانے کے لیے
جُھکا تو ایک لاٹھی میری پیٹھ پر اور ایک سر پر پڑی۔ میں سیدھا ہوا مگر آنکھوں
کے آگے اندھیرا آگیا، پھر میں بے ہوش ہوگیا.....

"ہوش واپس آئے تو میں پولیس کی لاری میں اس طرح پڑا تھا کہ
میرا سر فوزیہ کی گود میں تھا اور میں سیٹ پر بیٹھا تھا۔ لاری میں بہت سی
لڑکیاں تھیں اور چند ایک لڑکے بھی اس میں ٹھونسے ہوئے تھے۔ ایک
لڑکے کے کپڑے خون سے لال تھے اور اس کے سر پر سبز دوپٹہ لپٹا ہوا
تھا۔ یہ کسی لڑکی نے اُس کے زخم پر لپیٹا تھا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ درد کی

شدت الگ تھی۔ چوٹ بڑی سخت آئی تھی لیکن خون نہیں نکلا تھا۔ تین چار
لڑکیاں بھی زخمی تھیں اور تقریباً سب کھانس رہی تھیں اور ان کی آنکھیں
گہری لال تھیں۔ یہ گیس کے اثرات تھے.....

"پولیس کے چار پانچ سپاہی تھے۔ کسی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ ہمیں
جیل خانے میں قید کرنے کے لیے لے جایا رہا تھا لیکن لاری ویرانے میں
رک گئی اور ہمیں اتار دیا گیا۔ اس کے پیچھے ٹرک اور ایک اور لاری رُکی۔
ان میں سے بھی بہت سی خواتین کو اتارا گیا۔ اُن کے ساتھ بھی چند ایک
آدمی تھے جن میں زیادہ تر نوجوان تھے۔ لاریاں اور ٹرک چلا گیا۔ حکومت نے
یہ طریقہ بھی اختیار کر رکھا تھا کہ جلوس میں سے بہت سے لوگوں کو پکڑ کر لاریوں
میں ڈالتے اور شہر سے بیس پچیس میل دور اتار آتے تھے۔ ہمیں ملتان روڈ
پر کم و بیش تیس میل دُور اتارا گیا تھا۔ اُس دَور میں آبادی بہت کم تھی۔ پرائیویٹ
بسیں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔ ہم میں سے جو زخمی تھے ان کی دیکھ بھال
کی گئی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد لاہور کی طرف سے ایک بس آئی۔ یہ بالکل خالی
تھی۔ اس کے پیچھے چار پانچ کاریں تھیں۔ یہ سب ہمارے پاس رُک گئیں اور
ہم سب کو لاہور لے آئیں۔ یہ مسلم لیگ کا انتظام تھا.....

"میرے سر کی چوٹ مجھے پریشان کر رہی تھی۔ پیٹھ کی چوٹ بھی کم
شدید نہیں تھی۔ فوزیہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں اُسے بچانے اور اٹھانے کے
لیے گیا اور زخمی ہوا تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئی۔ میں انہی سیڑھیوں سے
اُوپر گیا جہاں فوزیہ کے ساتھ میری پہلی ملاقات رہزن کی حیثیت سے ہوئی
تھی۔ فوزیہ مجھے اُس گھر میں لے گئی جہاں میں چوری کے ارادے سے داخل
ہونے گیا تھا۔ فوزیہ کے والد بزرگوار چارپائی پر پڑے تھے۔ وہ صرف بیٹھ سکتے
تھے۔ میں ان سے جھینپ سا گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اپنی جوان بیٹی کے ساتھ ایک
اجنبی کو دیکھ کر وہ ناراض ہوں گے لیکن انہیں اپنی بیٹی کے کردار پر اس قدر

اعتماد تھا کہ مجھے خندہ پیشانی سے ملے۔ فوزیہ کی والدہ کا بھی روّیہ ایسا ہی تھا۔ یہ دونوں بزرگ ہنسیاں پاکستان کی باتیں کرتی تھیں۔ والد بزرگوار نے افسوس کا اظہار کیا کہ وہ اس جہاد میں شریک ہونے کے قابل نہیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو اس محاذ پر بھیج کر کچھ سکون حاصل کر لیا تھا.....

"آج اُس کردار کی جھلک بھی نہیں ملتی۔ لڑکیاں اور لڑکے اکٹھے رہتے، بھاگتے دوڑتے اور موقع ملے تو ہنس کھیل بھی لیتے تھے۔ اکیلی اکیلی لڑکی کو اکیلا اکیلا لڑکا گھر تک چھوڑنے بھی جاتا تھا مگر کبھی کسی بے ہُودگی کا اشارہ بھی نہیں ملتا تھا۔ ماحول اور فضا میں ایسی پاکیزگی تھی کہ مجھ جیسے گمراہ نوجوان بھی پاکیزہ بات کے سوا اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ والدین کو اپنی بیٹیوں پر بھروسہ تھا اور بیٹے دوسروں کی بیٹیوں کی آبرو کے پاسبان تھے۔ یہی مسلمان کی شان تھی جو آج کہیں نظر نہیں آتی۔ ایک تو یہ ماحول اور مقدّس مقصد تھا جس نے مجھے گمراہی سے بچایا لیکن انگریز کی لاٹھی کی دو ضربوں نے مجھے انسان بلکہ مسلمان بنا دیا.....

"ان دو ضربوں نے مجھے تین دن ہلنے نہ دیا۔ میں فوزیہ کے گھر رہا جہاں اس کی والدہ اپنے دیسی نسخے اور مرہم پٹی کرتی رہیں۔ چوتھے روز جسم ذرا سا ہلنے کے قابل ہوا تو میں گھر سے نکلا اور مظاہروں میں جا شامل ہوا۔ فوزیہ نے میری تیمارداری ایسے خلوص سے کی جو مجھے آج بھی حیران کر دیتی ہے...

"آپ نے ان جلوسوں اور مظاہروں کی بہت سی باتیں سُنی اور پڑھی ہوں گی۔ ایک بات شاید آپ کے لیے نئی ہو۔ ہمارے لیڈروں نے، تو جہادِ آزادی کو جلسے جلوسوں اور مظاہروں تک محدود رکھا تھا لیکن لاہور اور امرتسر کے نوجوانوں کے ایک گروہ نے درپردہ گوریلا جنگ اور تباہ کاری کی ٹریننگ شروع کر دی تھی۔ یہ جنگی قسم کی ٹریننگ تھی۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے لیڈروں کو اس کا علم تھا یا نہیں۔ ہمیں سابق فوجی

ٹریننگ دیتے تھے۔ مجھے بھی اس میں شامل کر لیا گیا تھا اور حلف لیا گیا تھا کہ حصولِ پاکستان کے لیے مجھے جو بھی فرض سونپا جائے گا پورا کروں گا اور جان کی قربانی دینے سے گریز نہیں کروں گا اور راز کی کوئی بات منہ سے نہیں نکالوں گا۔ گوریلا ٹریننگ کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی تھی کہ انگریز کی نیّت صاف نظر نہیں آتی تھی۔ اس گروہ کے نوجوانوں نے سوچا تھا کہ غیر مسلّح ہو کر جلوس نکالنا، لاٹھیوں اور گولیوں سے زخمی ہونا اور مرنا اور گرفتار ہو کر جیلوں میں بند ہو جانا کوئی لڑائی نہیں۔ اسے ہم یک طرفہ جنگ سمجھنے لگے تھے۔ انگریز اور ہندو کو شکست دینے کے لیے مسلّح جہاد ضروری ہو گیا تھا اور اس کا واحد طریقہ گوریلا جنگ تھا جسے انگریز دہشت پسندی کہتا رہا ہے۔ اس گروہ میں پٹھان نوجوان بھی شامل ہو گئے تھے۔ ہمارا پہلا اقدام یہ طے ہوا تھا کہ انگریز افسروں کو جن میں گورنر بھی شامل تھا دستی بموں سے ختم کیا جائے۔ ہمارا پروگرام تقریباً وہی تھا جو اس دور میں فلسطین کے فدائین کا ہے....

"اُسی سلسلے میں مجھے ایک روز امرتسر بھیجا گیا۔ وہاں کے اس گروہ کے لیڈر کے لیے ایک پیغام تھا جو زبانی دینا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب پنجاب میں مسلمانوں نے یہ فتح حاصل کر لی تھی کہ انگریز کی خوشامدی جماعت (یونینسٹ پارٹی) کی وزارت نے استعفیٰ دے دیا تھا، لیکن اس کا ردِعمل امرتسر میں اس طرح ظاہر ہوا کہ سکھوں نے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے۔ میں جس روز وہاں پہنچا اُس روز سکھوں کے ایک ہجوم نے مسلمانوں کے ایک جلوس پر ہلّہ بول دیا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ سکھوں کو پولیس اور انگریز کی شہ حاصل ہے اور یہ باقاعدہ پروگرام کے تحت حملہ ہوا ہے۔ پولیس نے [illegible] کی تو مسلمانوں کو ہی لاٹھیاں ماریں۔ مسلمانوں کا جوش [illegible]۔ انہوں نے مقابلہ بھی کیا لیکن ہر ایک سکھ برچھی یا کرپان یا لاٹھی سے مسلح تھا.....

"میں نے دیکھا کہ دو سپاہی ایک مسلمان لڑکے کو گھونسوں سے پیٹ

رہے تھے ۔ میں غصے سے بے قابو ہو گیا ۔ میری جیب میں چاقو تھا ۔ میں نے چاقو نکالا اور دوڑ کر ایک سپاہی کی پیٹھ میں چاقو اتار دیا ۔ دوسرے سپاہی نے گھما کر لاٹھی ماری جو میرے بائیں کندھے پر لگی ۔ میں پیچھے کو گرا ۔ چاقو میرے ہاتھ سے گر پڑا مگر سپاہی زخمی ہو چکا تھا ۔ اس کی لاٹھی گر پڑی ۔ میں نے لاٹھی اٹھا لی ۔ تین چار منٹ میرے اور دوسرے سپاہی کے درمیان لٹھ بازی ہوئی ۔ مجھے بھی ضربیں لگیں ، اُسے بھی لگیں لیکن پولیس پر ہاتھ ڈالنا بڑا خطرناک تھا ۔ معلوم نہیں مجھ پر کدھر کدھر سے لاٹھیاں پڑنے لگیں ۔ مجھے اتنا ہی ہوش رہا کہ سپاہی مجھے گھسیٹ رہے تھے ۔ ہوش آئی تو میں تھانے کے برآمدے میں پڑا تھا اور یہ برآمدہ اُن مسلمانوں سے بھرا پڑا تھا جنہیں گرفتار کر کے لائے تھے ۔ اتنے ہجوم کے لیے حوالات میں جگہ نہیں تھی ۔ پولیس کے سپاہی اِدھر اُدھر رائفلیں اٹھائے ٹہل رہے تھے اور وقت رات کا تھا ۔ مسلمانوں کا جانی نقصان بہت ہوا تھا ۔ میں آپ کو یہ بتانا بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ ہندو اور سکھ آپ کا کبھی دوست نہیں ہو سکتا ۔ ذرا اسی پر غور کریں کہ پنجاب میں انگریزی حکومت کی بنائی ہوئی وزارت مسلمانوں کے احتجاجی مظاہروں کی وجہ سے مستعفی ہو گئی تو امرتسر میں سکھوں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا ۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ پولیس نے سکھوں کی مدد کی ....

"میں مسلمانوں کے ہجوم میں تھانے میں بیٹھا تھا ۔ جسم کا جوڑ جوڑ اور ہڈی ہڈی درد کر رہی تھی ۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھے پولیس نہیں بخشے گی کیونکہ میں نے ایک سپاہی کو چاقو سے زخمی کیا تھا ۔ میں وہاں سے بھاگنے کی ترکیبیں سوچنے لگا لیکن فرار ممکن نظر نہیں آتا تھا ۔ خدا نے میری مدد اس طرح کی کہ پانچ چھ آدمیوں نے سپاہیوں سے کہا کہ وہ پیشاب کرنا چاہتے ہیں ۔ دو سپاہی انہیں لے چلے تو میں بھی اُن میں شامل ہو گیا ۔ بیت الخلا اندھیرے میں تھا ۔ ایک سپاہی رائفل لے کر ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف کھڑا ہو گیا ۔ تین

آدمی اندر گئے ۔ میں بھی ان کے پیچھے چلا گیا ۔ اندر بھی اندھیرا تھا ۔ بیت الخلا کی چھت اور پچھلی دیوار کے درمیان خلا تھا ، یعنی پچھلی دیوار چھت تک نہیں تھی ۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا ——— "میں یہاں سے کھسک رہا ہوں ۔ خیال رکھنا" ——— وہ سب مسلمان تھے ۔ ایک نے کہا ——— "کوشش کرو" ......

"میں نے پچھلی دیوار پر ہاتھ ڈالا ۔ دیوار اُونچی نہیں تھی ۔ کسی نے مجھے نیچے سے اُوپر اٹھایا اور میں دیوار اور چھت کے درمیان سے گزر کر پیچھے اُتر گیا ۔ اندھیرے نے فائدہ دیا ۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا ۔ سپاہی دوسری طرف تھے ، پھر بھی میں دیوار کے ساتھ دبکا رہا ۔ ایک سپاہی نے کہا ——— "جلدی کرو اوئے ، جلدی کرو" ——— ذرا سی دیر بعد وہ سب چلے گئے ۔ مجھے تھانے کے احاطے سے واقفیت نہیں تھی ۔ میں اندھیرے میں دور ایک بتی کی طرف چل پڑا ۔ مجھے چھوٹی سی ایک اور دیوار پھلانگنی پڑی اور میں تھانے سے نکل گیا ۔ جسم کی یہ حالت تھی کہ چلنا محال تھا ۔ میں رُوح کا زور لگا کر قدم گھسیٹتا گیا ۔ چلنے کی رفتار کچھ بھی نہیں تھی اور وہاں دوڑنے کی ضرورت تھی ۔ میں پیچھے دیکھتا اور چلتا گیا ۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ مجھے کوئی زخم نہیں آیا تھا ۔ لاٹھیوں ، ڈنڈوں اور گھونسوں کی اندرونی چوٹیں تھیں ۔ زخم ذرا سا بھی ہوتا تو کپڑوں پر خون لگ جاتا ۔ اس سے پکڑے جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا .....

"میں ابھی پیغام نہیں دے سکا تھا ۔ اس سے پہلے ہی میں سکھوں کے حملے میں پھنس گیا تھا ۔ اب میرا وہاں رُکنا ٹھیک نہیں تھا ۔ میرا جرم سنگین تھا ۔ میں ریلوے سٹیشن پر پہنچ گیا ۔ یہ میری قوتِ ارادی تھی جس نے مجھے بے ہوش نہ ہونے دیا ۔ قدم قدم پر غشی آتی اور میں سنبھلتا تھا ۔ لاہور کا ٹکٹ لے لیا ۔ گاڑی ڈیڑھ گھنٹہ بعد آئی ۔ میں لاہور آدھی رات کے بعد

پہنچا۔ جیب میں پیسے موجود تھے۔ تانگہ لیا اور میں فوزیہ کے گھر چلا گیا۔ میری دستک پر دروازہ اُس کی ماں نے کھولا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ فوزیہ بھی جاگ اٹھی تھی۔ میں نے اُسے دیکھا اور وہ اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ یہ بے ہوشی تھی جو بہت لمبی ہو گئی.....

"اب میں پولیس سے محفوظ تھا۔ خطروں سے نکل آیا تھا۔ بے ہوشی میں شاید مجھے نیند آ گئی۔ اگلے روز دوپہر کو آنکھ کھلی تو فوزیہ میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ کلیم اللہ بھی تھا اور دو اور کالج سٹوڈنٹ بھی۔ وہ پریشان نظر آتے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ مجھے کیا ہوا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں کس طرح یہاں تک پہنچا ہوں.....

"نوبت ہسپتال میں داخل کرانے تک پہنچ گئی لیکن میرے ساتھیوں نے اس خطرے کے پیشِ نظر مجھے ہسپتال داخل نہ کرایا کہ میں پکڑا جاؤں گا۔ دوسرا خطرہ یہ تھا کہ ہسپتالوں میں زیادہ سٹاف ہندو تھا۔ وہ مسلمان زخمیوں کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتے تھے۔ ایک مسلمان ڈاکٹر گھر آ کر مجھے دیکھ جاتا اور علاج کرتا تھا۔ سر کی چوٹیں اتنی شدید تھیں کہ پندرہ دنوں بعد بھی میں اُٹھتا تھا تو درد کی ٹیسیں اُٹھتیں اور چکر آتے تھے۔ ڈاکٹر نے اس خطرے کا اظہار کیا تھا کہ دماغ میں کوئی دائمی نقص نہ پیدا ہو گیا ہو۔ یہ حالت ڈیڑھ مہینہ رہی، پھر حالت بہتر ہونے لگی۔ میں جب باہر نکلنے کے قابل ہوا تو ۳ جون ۱۹۴۷ء کا وہ مبارک دن طلوع ہوا جب ہندوستان کی تقسیم کا اعلان ہو گیا — ہم نے منزل پالی.....

"یہ تو قوم کی منزل تھی۔ میری مسافت بھی جو پیار کی محرومی کے موڑ سے تباہی کے راستے پر چل نکلی تھی، فوزیہ کے گھر کی اندھیری سیڑھیوں سے سیدھے راستے پر چلی اور انہی سیڑھیوں کے اوپر جا کر ختم ہو گئی۔ یہ میری منزل تھی۔ مجھے یہ منزل فوزیہ نے، اس کے معذور باپ نے اور اس کی ماں نے دی اور میں

وہیں کا ہو رہا۔ پاکستان بننے کے تین ماہ بعد میری شادی فوزیہ کے ساتھ ہو گئی۔ مجھے گھر سے بھاگے ایک سال ہو گیا تھا۔ میں اب اُس طرف کا رُخ نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن ایک روز اپنے شہر کا ایک آدمی مل گیا۔ اُس نے بتایا کہ میرا سگا باپ کرنل ہو گیا تھا اور جنگِ عظیم کے فوراً بعد پنشن پر گھر آ گیا تھا.....

" مجھے طیش آ گیا۔ ایک آدھ مہینے بعد میں فوزیہ سے یہ کہہ کر کہ اپنی ماں کو دیکھنے جا رہا ہوں، اپنے سگے باپ کے شہر چلا گیا۔ میری جیب میں بڑے سائز کا چاقو تھا۔ باپ مل گیا اور وہ اچھی طرح ملا بلکہ اُس کے آنسو بھی نکل آئے۔ میں نے اُسے کہا کہ جناب کے آنسو میرے لیے بیکار ہیں۔ میں جائیداد میں سے اپنا حصہ لینے آیا ہوں۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ دوسری بیوی کے ہاتھوں پریشان تھا۔ میں نے اس کی بیوی کو بھی دیکھا۔ بہت خوب صورت تھی اور جوان۔ میرا باپ ابھی پچاس سال کا بھی نہیں ہوا تھا مگر ستّر سال کا بوڑھا لگتا تھا۔ باپ نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا کرتا ہوں اور اُس نے یہ بھی کہا کہ میں اس کے ساتھ رہوں۔ مجھے اس شخص سے اتنی نفرت ہو گئی تھی کہ میں نے اس کے سوالوں کے جواب میں اپنا مطالبہ دہرایا کہ میں اپنا حصّہ لینے آیا ہوں۔ اس نے حصّہ دینے سے انکار نہ کیا۔ اُس کی بیوی نے میرے ساتھ تلخ کلامی کی۔ میرا باپ اُس سے اس قدر مرعوب تھا کہ اُسے چُپ نہ کرایا۔ یہ کام مجھے کرنا پڑا لیکن میں نے یہ کام شریفوں کی زبان میں نہیں کیا۔ میں نے غنڈوں کی زبان استعمال کی.....

"مجھے حصّہ مل گیا۔ پھر میں ماں سے ملا۔ اُس کی صحت جواب دے گئی تھی۔ میری بہن کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ میرے سوتیلے باپ میں جہیز بنانے کی ہمت نہیں تھی۔ میں نے یہ فرض اپنے ذمّے لے لیا۔ باپ سے جائداد کا جو حصّہ لیا تھا وہ بیچ کر بہن کا جہیز بھی بنایا اور اُسے نقد رقم بھی دی۔ اس سے ماں کا غم ہلکا ہو گیا۔ بہن کی شادی اپنے ہاتھوں کی۔ سوتیلے باپ نے

بھی مجھے کہا کہ میں اُس کے پاس رہوں لیکن فوزیہ کے باپ کو میری زیادہ ضرورت تھی ......

"اب اُن میں سے کوئی بھی زندہ نہیں۔ فوزیہ زندہ ہے۔ میں زندہ ہوں۔ میں اپنے گھر میں لڑائی جھگڑا نہیں ہونے دیا کرتا۔ کبھی مجھے اور فوزیہ کو کسی بات پر جھگڑا کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو ہم بچوں کے سامنے ایسی بات نہیں کیا کرتے۔ اُن کے سو جانے کے بعد آپس میں اُلجھتے اور مسئلے سُلجھا لیتے ہیں۔ بچوں کو ہم پیار اور صلح صفائی سے مالامال کرتے رہتے ہیں تاکہ ہم مر جائیں تو ہمارے بچے میری اور فوزیہ کی روایت کو زندہ رکھیں۔"

بھٹکی ہوئی منزل

زاھدہ

کو میں نے تیس سال بعد دیکھا ہے۔ اُس کے چہرے پر وہی جوانی، آنکھوں میں وہی شوخی اور ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی جو تیس سال پہلے امرتسر میں دیکھی تھی۔ اس کی عمر کم و بیش پچاس سال ہونی چاہیئے تھی لیکن وہ بیس سال سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ اسے دیکھ کر میں چکرا گیا اور ذہن مجھے ۴۶، ۱۹۴۷ء کے دَور میں لے گیا۔

جنوری ۱۹۴۷ء کا غالباً آخری ہفتہ تھا۔ پنجاب میں انگریزوں کے نامی گرامی پٹھو خضر حیات ٹوانہ کی حکومت تھی۔ وہ انگریزوں کے پروردہ جاگیرداروں کی جماعت یونینسٹ پارٹی کا سربراہ اور صوبے کا وزیرِاعلیٰ تھا۔ اس کی وزارت میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور سکھ بھی تھے۔ مسلم لیگ جو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تھی، پاکستان کے نام پر الیکشن جیت چکی تھی مگر انگریزوں کی حکومت اپنے دیسی حاشیہ برداروں کی مدد کے بھروسے پر مسلم لیگ کو صوبے کی حکومت دینے سے گریز کر رہی تھی۔

خضر حیات ٹوانہ نے مسلم لیگ نیشنل گارڈ کو خلاف قانون قرار دے دیا اور صوبے کے صفِ اوّل کے مسلم لیگی لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ مسلمانوں کو دہشت زدہ کرنے اور قوم کے عزم کو متزلزل کرنے کا کام فوج کو سونپ دیا گیا تھا۔ فوج یہ کام انگریزوں اور ہندوؤں کی مرضی کے عین مطابق خوش اسلوبی سے کر رہی تھی۔

کوئی مسلمان کسی ہندو یا سکھ کے ہاتھوں قتل ہو جاتا تو مسلمانوں کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ اُلٹا مسلمانوں پر فرقہ وارانہ فساد کا الزام عائد کیا جاتا تھا۔

قوم پہلے ہی بھری بیٹھی تھی۔ ٹوانہ کے نئے احکام نے جلتی پر تیل چھڑک دیا۔ قوم میدان میں نکل آئی۔ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزیاں کیں، کرفیو کی خلاف ورزیاں کیں، جلوس نکالے، مظاہرے کیے، سرکاری عمارتوں پر مسلم لیگ کے جھنڈے چڑھائے۔ پولیس سٹیشنوں، کچہریوں، ڈاک خانوں وغیرہ پر ہلّے بول کر قبضے کیے۔ ریل گاڑیاں روکیں اور انگریز کی مشینری کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔

انگریزوں کی دیسی پولیس اور فوج نے مسلمانوں پر جو غیر انسانی تشدد کیا اور جس طرح قوم اس تشدد کے خلاف لڑی وہ ملی جذبے اور جذبۂ ایثار کی ایسی حیران کن داستان ہے کہ آج اس پر یقین نہیں آتا۔ میں خود اس جنگِ آزادی کا سپاہی تھا مگر آج یہ داستانِ جہاد من گھڑت کہانی لگتی ہے۔ دل میں آتی ہے کہ اسی جہاد کی تفصیلات سناتا رہوں تاکہ آج کے نوجوانوں کو پتہ چلے کہ اُس وقت کے نوجوان کیسے تھے اور اُن کی مائیں انہیں کس شوق سے جلوسوں میں شرکت کے لیے گھروں سے رخصت کیا کرتی تھیں۔ ماؤں کو معلوم تھا کہ ان کے بچے جو جلوس میں شرکت کرنے کے لیے چلے گئے ہیں سبھی واپس نہیں آسکیں گے۔ ان پر آنسو گیس چھوڑی جائے گی، ان پر بے دردی سے لاٹھیاں برسائیں جائیں گی، ان پر گولی بھی چلے گی اور اندھا دھند پکڑ دھکڑ ہو گی۔

میں اتنی لمبی کہانی نہیں سُنا سکوں گا۔ ایک واقعہ سنا رہا ہوں۔

میں اُس وقت اپنے آبائی شہر امرتسر میں تھرڈ ایئر کا سٹوڈنٹ تھا۔ جنگِ آزادی میں نوجوانوں خصوصاً طلبہ اور طالبات پیش پیش تھیں بلکہ ہراول میں نوجوان طبقہ ہی ہوتا تھا۔ اس وقت مسلمان طالبات کی تعداد آج کی نسبت بہت کم تھی۔ طلبہ اور طالبات نے پڑھائی کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا اور پورا وقت تحریک پاکستان کو دے رہے تھے۔ امرتسر میں بھی ہر روز مسلمانوں کے جلوس نکلتے اور

پولیس کے تشدد کا نشانہ بنتے تھے۔ نوجوان لڑکے جلوسوں کا اہتمام کرتے اور نوجوان لڑکیاں عورتوں کے جلوسوں کا الگ بندوبست کرتی تھیں۔ لڑکیاں اور لڑکے جوش اور جذبے سے بارودی سرنگیں بنے ہوئے تھے لیکن ان میں ڈسپلن ایسا تھا کہ بے لگام نہیں ہوتے تھے۔ کسی قسم کی بدتمیزی نہیں کرتے تھے اور لڑکیوں کی حفاظت کو فرضِ اوّلین سمجھتے تھے۔

میرے والد صاحب فوج میں صوبیدار تھے۔ ہمیں یعنی ہماری فیملی کو ان کے ساتھ ہونا چاہیئے تھا لیکن ان کی تبدیلی ایک سے دوسری چھاؤنی میں ہوتی رہتی تھی اس لیے میری اور میری بہنوں کی تعلیم میں گڑبڑ ہو جاتی تھی۔ اس مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ والد صاحب کئی سالوں سے اکیلے رہ رہے تھے اور ہم اپنی والدہ کے ساتھ امرتسر میں رہتے تھے۔

والد صاحب برما فرنٹ پر لڑے تھے۔ ان کی سروس پوری ہو چکی تھی۔ وہ انہی دنوں پنشن پر آگئے جب پنجاب میں ٹوانہ بلکہ انگریزوں کے خلاف خونی مظاہرے ہو رہے تھے۔ ان کا خط آیا تھا کہ وہ فلاں روز فلاں گاڑی سے امرتسر پہنچ رہے ہیں۔ میں ہی گھر میں بڑا تھا۔ میرے سوا اور کوئی بھائی نہیں تھا۔ مجھے والد صاحب کے استقبال کے لیے سٹیشن پر جانا تھا مگر میں نہ جا سکا۔ ان کے آنے کے وقت میں جلوس کے ساتھ تھا۔ میں منتظمین میں سے تھا اس لیے مجھے جلوس کے بعد رات تک مسلم لیگ کے دفتر میں رہنا پڑتا تھا۔

رات کے غالباً دس بج چکے تھے جب میں گھر میں داخل ہوا۔ والد صاحب کو دیکھ کر یاد آیا کہ انہوں نے آنے کی اطلاع دی تھی اور مجھے سٹیشن پر جانا تھا۔ ہمیں ملے ایک سال ہو گیا تھا۔ ہم گلے لگ کے ملے۔ والد صاحب نے گلہ تو نہ کیا لیکن وہ اتنا خوش بھی نہ ہوئے جتنا اکلوتے بیٹے کو دیکھ کر کسی باپ کو خوش ہونا چاہیئے تھا۔ مجھ سے پوچھا کہاں تھے؟ میں نے بتایا تو کہنے لگے ———— "جن انگریزوں کی حکومت مجھے تاحیات پنشن دے گی اور جس انگریز کی دی ہوئی تنخواہ پر تم تعلیم

حاصل کر رہے ہو تم اسکی حکومت کے خلاف نعرے لگاتے پھرتے ہو۔ یہ لوگ (مسلمان لیڈر) بے وقوف ہیں۔ تم لوگ حکومت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

میرے والد صاحب نے کبھی چار پانچ جماعتیں پڑھی تھیں۔ پھر باپ کی کھیتیوں میں کام کیا اور فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ انگریز کی دی ہوئی تنخواہ اور راشن ان کے خون میں شامل ہو گیا تھا۔ وہ سروس کے دوران انگریزوں کی بہت تعریفیں کیا کرتے تھے۔ اب تو وہ بوڑھے ہو کر گھر آ گئے تھے۔ آتے ہی انہوں نے مجھے مسلمان لیڈروں کے خلاف اور انگریزوں کے حق میں لیکچر دیا تو میں نے پورے احترام اور فرمانبرداری سے بتایا کہ میں جلوسوں میں کیوں شامل ہوتا ہوں۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ اب کوئی مسلمان اپنے آپ کو قوم سے الگ نہیں کر سکتا۔

والد صاحب نے میری باتیں سن تو لیں مگر وہ قائل ہوتے نظر نہیں آ رہے تھے۔

میری دو بہنیں تھیں۔ ایک بڑی جس نے میٹرک پاس کر لی تھی اور ایک چھوٹی جو دسویں جماعت میں تھی۔ وہ عورتوں کے جلوسوں میں شامل ہوتی تھیں۔ والد صاحب نے انہیں فوجی قسم کا حکم دے دیا کہ اب وہ گھر سے باہر قدم نہیں رکھیں گی۔ وہ کچھ بھی نہ کر سکیں لیکن میں باز نہ آیا۔ والدہ نے منت سماجت کے لہجے میں کہا کہ میں ان کا ایک ہی بیٹا ہوں۔ اگر میں مارا گیا یا زخموں سے بیکار ہو گیا تو ماں باپ کیسے زندہ رہ سکیں گے۔ اس سے پہلے والدہ نے مجھے کبھی نہیں روکا تھا میں ان کی حکم عدولی سے بھی ڈرتا تھا لیکن قوم نے جو فرائض مجھے سونپے تھے، میں انہیں بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس طرح میں چکی میں پسنے لگا۔

میں نے باتوں باتوں میں والدہ کو راضی رکھا۔ مجھے جھوٹ بولنے پڑتے تھے۔ والد صاحب کو بھی دھوکے میں رکھا اور تحریک میں سرگرم رہا۔

پانچ سات دنوں بعد میں گھر میں تھا۔ ایک سکھ تھانیدار ہمارے گھر آیا۔ اس کے ساتھ شہر کے دو سرکردہ ہندو تھے جو کانگرسی تھے اور ایک سکھ تھا۔ یہ

گوردوارہ کمیٹی کا ممبر تھا۔ یہ سب میرے والد صاحب سے ملنے آئے تھے۔ مجھے بھی بیٹھک میں بلا لیا گیا۔ تھانیدار نے دوستانہ لہجے میں بات کی۔ اس نے کئی بار پیار سے میرے سر پر اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔

میرے والد صاحب سے مخاطب ہو کر اس نے ایک لمبا لیکچر شروع کر دیا جو مختصر الفاظ میں یوں تھا ——— "اتنی لمبی اور اتنی سخت سروس کے بعد پنشن ملی ہے۔ آپ کو گورنمنٹ کچھ زمین بھی دے گی جس سے آپ جاگیردار بن جائیں گے مگر آپ کا برخوردار جوانی کے جوش میں آپ کو پنشن اور زمین سے محروم کر رہا ہے۔ اس کی (میری) گرفتاری کا حکم کبھی کا آیا ہوا ہے لیکن میں نے اسے دبا لیا ہے۔ میں نے ڈپٹی کمشنر سے کہہ دیا ہے کہ یہ لڑکا اس صوبیدار کا بیٹا ہے جو تین سال برما فرنٹ پر لڑا ہے۔ اسے ہم سنبھال لیں گے لیکن آپ کا بیٹا اپنے ہاتھوں ہتھکڑیاں پہن رہا ہے۔ یہ گولی کا نشانہ بھی بن سکتا ہے اور اگر کبھی آنسو گیس کا شیل اس کے منہ پر لگ گیا تو اس کا اتنا اچھا چہرہ بدصورت ہو جائے گا اور ہمیشہ کے لیے اندھا بھی ہو جائے گا۔ اس نقصان کے ساتھ آپ کے خاندان کو سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ آپ کی پنشن روک لی جائیگی اور آپ دیگر مراعات کے بھی نااہل قرار دے دیئے جائیں گے۔"

اس نے بات ختم کی تو ہندو اور سکھ لیڈر باری باری بولے۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے انہیں ملک کی آزادی کے ساتھ اتنی دلچسپی نہیں جتنی ہمارے خاندان کی بہتری کے ساتھ ہے۔ انہوں نے میرے والد صاحب کو نہایت پیار سے لہجے اور گہرے دوستانہ طریقے سے وہی دھمکیاں دیں جو سکھ تھانیدار دے چکا تھا۔

میرے والد صاحب پر گہرا اثر ہو رہا تھا۔ ان کی زبان جیسے بند ہو گئی تھی۔ وہ ڈر گئے تھے۔ میں بھی چپ بیٹھا رہا، لیکن میری خاموشی کا باعث ڈر نہیں تھا بلکہ یہ کہ ان کی یہ باتیں اور یہ دھمکیاں اور مسلمان لڑکوں کو جلوسوں اور سیاسی سرگرمیوں سے ہٹانے کا یہ طریقہ میرے لیے نیا نہیں تھا۔ یہ لوگ مسلمان لڑکوں

اور لڑکیوں کے باپوں کے پاس جاتے اور انہیں ڈراتے تھے۔ لڑکے سناتے رہتے تھے لیکن اللہ اُن تمام باپوں کو جو اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں غریقِ رحمت کرے، ان میں بہت کم ایسے تھے جو ڈرتے تھے۔ باپ خود جنگِ آزادی میں شریک تھے۔ میرے والد صاحب چونکہ فوجی تھے اس لیے ڈر گئے۔ انہیں پنشن بھی عزیز تھی اور اپنا اکلوتا بیٹا بھی عزیز تھا۔ وہ چونکہ سیاسی میدان سے بہت دور رہے تھے اس لیے قوم کے مسائل اور قوم کے دشمنوں سے واقف نہیں تھے۔

تھانیدار اور دوسرے لیڈر چلے گئے تو میں والد صاحب کے سامنے موجود رہا۔ مجھے یہ نظر آرہا تھا کہ والد صاحب مجھے مارشل لا کے کسی ضابطے جیسا حکم دیں گے کہ آج سے تم گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے، اور اب تمہیں کالج جانے کی بھی اجازت نہیں۔ انہوں نے تھانیدار اور اس کے ساتھیوں سے کہہ دیا تھا کہ آپ میرے لڑکے کو کسی جلوس میں نہیں دیکھیں گے۔ ان کے جانے کے بعد والد صاحب کمرے میں ٹہلتے رہے۔ پھر میرے پاس بیٹھ گئے۔

"میری باتیں غور سے سننا بیٹا!" ——— والد صاحب ایسی آواز میں بولے جس میں فوجی دبدبہ نہیں تھا۔ اس آواز میں پیار تھا، شفقت تھی اور اس میں کچھ التجا کا رنگ بھی تھا۔ انہوں نے کہا ——— "میں تمہارے مقابلے میں اَن پڑھ ہوں۔ یہ میری خواہش تھی کہ اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلاؤں گا اور اُونچے رُتبے حاصل کرنے کے قابل بنا دوں گا۔ خدا نے مجھے ایک ہی لڑکا دیا۔ مَیں نے تمہیں تعلیم دلائی۔ تمہاری ایک بہن کو دس جماعتیں پاس کرائیں۔ چھوٹی دسویں میں پڑھ رہی ہے۔ ان کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ تمہیں میں ایم۔اے ضرور کراؤں گا۔ تم نہیں جانتے کہ میرے ساتھ کے فوجی اپنے بال بچوں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور جہاں تبدیلی ہوتی ہے انہیں ساتھ لے جاتے ہیں۔ انہیں اپنے آرام کا خیال زیادہ ہوتا ہے۔ وہ بچوں کی تعلیم کا خیال نہیں رکھتے، نہ ضرورت سمجھتے ہیں۔ ان کے بیٹے جوان ہو کر فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں، لیکن میں نے

تمہیں تعلیم دلانے کے لیے تم سب کو امرتسر میں رہنے دیا اور خود تنگی کی روٹیاں کھاتا رہا۔ میں نے پیٹ باندھ کر پیسہ بچایا اور اپنا آرام قربان کر دیا۔۔۔

"میں نے تمہاری خاطر اپنی کوئی حیثیت نہ رہنے دی۔ جلدی ترقی حاصل کرنے کے لیے اپنے کام پر پوری توجہ دی اور افسروں کو خوش کرنے کے لیے میں نے خوشامد اور بھنگیوں جیسی غلامی کا طریقہ اختیار کیا۔ میں جب نائک اور حوالدار تھا تو میں نے صوبیداروں اور جمعداروں کے کوارٹروں میں جا جا کر ان کے ذاتی کام کیے۔ چغلیاں کیں اور جی حضوری اتنی کی کہ آج مجھے بیان کرتے شرم آتی ہے۔۔۔

اُس بے ایمانی نے مجھے جمعداری اور پھر صوبیداری دی۔ انگریز افسروں کے آگے میں نے صرف سجدے نہیں کیے باقی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ سب اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے کیا۔ پھر جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ میری یونٹ کو برما فرنٹ پر بھیجا گیا۔ تم نہیں سمجھ سکتے کہ برما فرنٹ کیسا تھا۔ موت کا خطرہ تو ہر وقت رہتا تھا لیکن زیادہ خطرہ بیماری کا تھا۔ وہاں کے جنگل مچھروں اور جونکوں سے بھرے پڑے ہیں۔ میں دو بار سخت بیمار ہوا۔ دونوں بار ملیریا کا حملہ ہوا تھا میں بہت کمزور ہو گیا تھا۔ میں تمہیں جو خط لکھتا رہا، اس میں اپنی بیماری کا ذکر تک نہ کیا۔ یہی لکھا کہ میں بالکل خیریت سے ہوں تاکہ تم لوگ پریشانی سے بچے رہو۔ اتنی سخت بیماری کے بعد مجھے چھٹی لینی چاہیے تھی لیکن میں نے انگریز افسروں کو خوش کرنے کے لیے چھٹی نہ مانگی۔۔۔

"دوسری بیماری کے بعد فرنٹ پر گیا تو میری ٹانگ میں گولی لگ گئی۔ خون اتنا نکل گیا کہ مَیں بے ہوش ہو گیا۔ مجھے بے ہوشی کی حالت میں اٹھایا گیا اور چٹا گانگ بھیج دیا گیا۔"

والد صاحب نے مجھے اپنی ٹانگ دکھائی۔ ران کے دونوں طرف زخموں کے بڑے ہی بھدے نشان تھے۔ انہوں نے کہا ——— "میں نے تمہیں اطلاع نہ دی۔ ہسپتال سے خط لکھا تو اس میں خیر خیریت لکھی۔ میرا ایک دوست میرے

وارڈ میں تھا۔ اس نے ایک روز میرے ساتھ افسوس کیا کہ مجھے گولی لگ گئی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ اپنے بیٹے کے مستقبل کے لیے میں ایسی گولی سینے میں کھانے کو تیار ہوں۔ میں نے یہ زخم بھی سہہ لیے .....

"میں نے جو مصائب برداشت کیے ہیں وہ تمہارے تصوروں میں نہیں آسکتے۔ یہ سب تمہاری تعلیم کی خاطر اور تمہاری بہنوں کے جہیز کی خاطر تھا۔ تمہاری بہنوں کا بوجھ تمہارے سر پر نہیں ڈالوں گا۔ میرے دل میں ایسی کوئی خواہش نہیں کہ تم پڑھ لکھ کر اچھے رُتبے کی نوکری کرو گے تو میرے اور اپنی ماں کے بڑھاپے کا سہارا بنو گے۔ میں تمہیں اپنے بڑھاپے کا سہارا نہیں بنا رہا۔ مجھے پنشن مل جائے گی۔ زمین موجود ہے، گورنمنٹ بھی دے گی۔ میرے لیے اور تمہاری ماں کے لیے یہ بہت ہے .....

"میں نے اپنی جوانی، اپنا آرام تمہارے لیے تباہ کیا مگر تم، مجھے معلوم نہیں کس جرم کی سزا دے رہے ہو۔ کیا میں نے ساری عمر صرف اس لیے تباہ کی ہے کہ آخری عمر میں مجھے اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں روزی سے محروم کر دیا جائے گا؟ کیا میرا بیٹا مجھے یہ صِلہ دے گا؟" ——— والد صاحب کی آواز بھرّا گئی اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں انہیں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ بڑا ہی لمبا لیکچر میرے دماغ میں آ گیا تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ میری تقریر سُن کر وہ اپنے خیالات بدل دیں گے اور مجھ پر کوئی پابندی عائد نہیں کریں گے، لیکن ان کی باتیں سُن کر اور ان کے آنسو دیکھ کر میرے دماغ میں نہ کوئی لیکچر رہا نہ کوئی تقریر۔

میرے والد صاحب فطرۃً خوشامدی نہیں تھے۔ بزدل بھی نہیں تھے۔ وہ کسی کے آگے جھکنے والے نہیں تھے۔ برادری میں ان کا اچھا مقام تھا۔ دوسروں کو باتوں کے وزن سے اور ضرورت پڑے تو رُعب سے بھی دبا لیا کرتے تھے۔ اس شخص نے میری خاطر افسروں کی خوشامدیں کیں اور سر جھکائے رکھا۔ مجھے والد صاحب کی وہ عمر یاد آئی جب میں بچّہ تھا۔ ان کے چہرے پر جوانی کی رونق تھی۔

جسم بھرا ہوُا تھا مگر اب ان کا چہرہ برما فرنٹ نے، ملیریا کے حملوں نے اور کمزوری نے اور برما جیسے پہاڑی اور جنگلاتی علاقے کی جنگ نے چوس لیا تھا۔ جسم میں میرے بچپن کے دَور والی طاقت نہیں رہی تھی۔ انہوں نے یہ قربانی میرے لیے اور میری بہنوں کے لیے دی تھی۔

ان کے لہجے میں التجا کا رنگ اور آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میں نے اپنے آپ سے کہا ——— "میرے باپ نے میرے لیے ہندو، سکھ، عیسائی اور انگریز افسروں کی خوشامدیں کیں اور ان کی خوشنودی کے لیے جانے کیسے کیسے گھٹیا کام کیے۔ یہ باپ اپنے بیٹے کی خوشامد نہیں کرے گا۔ میں اس باپ سے کہوں گا کہ مجھے حکم دو۔"

"اباجی!" ——— مَیں نے کہا ——— "مَیں آئندہ کسی جلوس میں شریک نہیں ہوں گا۔ اتنی سی بات ضرور کہوں گا کہ دوسرے مسلمانوں کو نہیں تو اپنی برادری کے رویّے کو ضرور دیکھ لینا۔ میں آپ کی حکم عدولی نہیں کروں گا مگر مجھے ڈر یہ ہے کہ برادری آپ کو انگریزوں کا پٹھو کہہ کر آپ کے ساتھ قطع تعلق کر لے گی۔ اس وقت قوم انگریزوں کے بہت بڑے پٹھو، خضر حیات ٹوانہ کے خلاف لڑ رہی ہے۔"

والد صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ ان کے چہرے پر اسی خوشی نے رونق پیدا کر دی کہ ان کے بیٹے نے ان کا کہا مان لیا ہے۔ میں نے بہت بڑی قربانی دی تھی۔ میں نے دل پر صحیح معنوں میں بہت وزنی پتھر رکھ لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اپنے ساتھیوں کو منہ نہیں دکھا سکوں گا۔ وہ مجھے ڈھونڈیں گے اور مَیں چھپتا پھروں گا۔ میرے نوجوان ساتھیوں پر لاٹھیاں برس رہی ہوں گی۔ ان پر گولیاں چل رہی ہوں گی اور مَیں گھر میں چھپ کر عورتوں کی طرح آنسو بہایا کروں گا۔ میں دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ خدایا میرے والد صاحب کے دل میں وہی شمع جلا دے جو میرے دل میں جل رہی ہے۔

مَیں نے چار روز گھر میں قید رہ کر گزارے ۔ دو بار میرے ساتھی میرے گھر آئے ۔ میرے کہنے پر میرے والد صاحب نے انہیں کہا کہ میں لاہور چلا گیا ہوں۔ دو تین لڑکیاں بھی آئی تھیں جنہیں مَیں نے نہ دیکھا ۔ میری بہنوں کے پاس بیٹھ کر چلی گئیں ۔ یہ لڑکیاں یہی معلوم کرنے آئی تھیں کہ میری بہنیں باہر کیوں نظر نہیں آتیں اور میں کہاں غائب ہو گیا ہوں ۔

ان کے جانے کے بعد میری بڑی بہن نے مجھے بتایا کہ اس سے جھوٹ نہیں بولا گیا ۔ اس نے لڑکیوں کو یہ بتانے کی بجائے کہ مَیں لاہور چلا گیا ہوں ، انہیں بتا دیا کہ ہمارے والد صاحب پنشن پر گھر آ گئے ہیں اور انہوں نے ہم سب کو سیاسی سرگرمیوں سے روک دیا ہے ۔

اس سے اگلے روز کا واقعہ ہے ۔ میں دوپہر کا کھانا کھا کر اپنے کمرے میں لیٹا اور میری آنکھ لگ گئی ۔ تھوڑی ہی دیر بعد میری آنکھ کھُل گئی ۔ دل بوجھل تھا ۔ آنکھ کسی عورت کی اونچی اونچی باتوں سے کھلی تھی ۔ وہ میرے ساتھ والے کمرے میں بول رہی تھی ۔ میں نے دونوں دروازوں کے درمیان والے دروازے کے ساتھ کان لگایا ۔ آواز تو میں سُن رہا تھا ۔ میں اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

مَیں نے پہچان لیا ۔ یہ ایک نوجوان لڑکی زاہدہ کی آواز تھی ۔ اُس وقت وہ سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی اور تقریر کرنے کی ماہر تسلیم کی جاتی تھی ۔ عورتوں کے جلوسوں کی ابتدا اسی نے کی تھی ۔ نوجوان لڑکیوں کو بھی باہر وہی لائی تھی ۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کارنامے کا سہرا چار بڑی بیگموں نے اپنے سر سجا لیا ہے ۔ اس کے پیچھے دراصل زاہدہ اور اس کی چار پانچ سہیلیوں کا ہاتھ تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ میدانِ عمل میں کودنے کا کارنامہ ہر اُس خاتون کا کارنامہ ہے جو گھر سے نکل آئی اور مردوں کے دوش بدوش برطانوی استبداد کے خلاف لڑی تھی ۔

زاہدہ شاید بہت دیر سے میرے والد صاحب سے ہمکلام تھی ۔ وہ اپنی

مخصوص جوشیلی اور جذباتی آواز میں کہہ رہی تھی —— "آپ اُس انگریز کے لیے جاپانیوں کے خلاف لڑتے رہے ہیں جس نے مرہٹوں کو ساتھ ملا کر سُلطان ٹیپو کو شکست دی تھی ۔ اس انگریز نے سکھوں کو ساتھ ملا کر سیّد احمد شہید کو شکست دی ۔ اس انگریز نے ۱۸۵۷ء کے مجاہدینِ آزادی کو توپوں کے دہانوں کے آگے باندھ کر توپیں داغیں ۔ انہیں درختوں کے ساتھ پھانسی دے کر لٹکایا اور مسلمانوں کے گھروں کو لُوٹا ۔ آگ لگائی اور پردہ نشین لڑکیوں کو ذلیل و خوار کیا ۔ دِلّی کی جامع مسجد کو اصطبل بنایا ۔ آج پھر ہندو اور سکھ انگریزوں کے دوست بن گئے ہیں ۔ تاریخ آج اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے ۔ محمد بن قاسم آپ کی بیٹیوں جیسی ایک لڑکی کی پکار پر کہاں سے کہاں آن پہنچا تھا ۔ انہوں نے گھر چھوڑے ، یہاں آ کر جانیں قربان کیں اور اس ملک میں اسلام پھیلایا ۔ آپ نے محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کو اپنے گھر میں قید کر لیا ہے ۔"

زاہدہ کی آواز جذبے کے جوش اور جذبات کی شدت سے کانپنے لگی تھی ۔ وہ کہہ رہی تھی —— "آپ ان ہندوؤں اور سکھوں کی دھمکیاں سُن کر ڈر گئے ہیں جو صدیوں ہمارے آباؤ اجداد کے غلام رہے ہیں ۔ آپ کو انگریز کے حکم پر جان دینا زیادہ اچھا لگا اور جس رسولؐ کا آپ کلمہ پڑھتے ہیں ، اس کے جہاد سے آپ اپنے بیٹے کو روک رہے ہیں ۔ آپ صرف اس لیے مسلمان کہلاتے ہیں کہ آپ مسلمان باپ کے گھر پیدا ہوئے تھے ۔ آپ اسلام کے چہرے پر بدنما داغ ہیں ۔ چھوڑیں اس مذہب کو ۔ ہندو یا سکھ ہو جائیں ۔ مَیں نے یہ جو دو چوڑیاں پہن رکھی ہیں ، یہ آپ پہن لیں ۔ آپ میں غیرت نہیں ، آپ بزدل ہیں ۔ مرتد ہیں ۔ آپ کی رگوں میں سومنات کے پجاریوں کا خون دوڑ رہا ہے ۔ مجھے دیکھیں آپ کی بیٹی ہوں ۔ باہر سڑکوں پر اور بازاروں میں مجھے اور مجھ جیسی لڑکیوں کو دیکھیں۔ آپ مرد کہلانے کے قابل نہیں ۔ کرائے کی لڑائی لڑ کر آپ سینہ چوڑا کر کے پنشن پر آ گئے ہیں ۔ ٹیپو شہید کے یہ الفاظ آپ کے کانوں میں نہیں پڑے کہ شیر کی ایک

دن کی زندگی گیدڑ کی سوسالہ زندگی سے بہتر ہوتی ہے۔ آپ گیدڑوں کی طرح زندہ رہیں، پنشن کھائیں اور انگریز کی عطا کی ہوئی جاگیر کا اناج کھائیں۔"

میرا خون کھول رہا تھا۔ میں اپنے والد صاحب کو جانتا تھا۔ وہ فوج میں خوشامدی رہے ہوں گے لیکن برادری میں کسی کو سر نہیں اٹھانے دیتے تھے۔ میرے دل میں یہ ڈر پیدا ہو گیا کہ والد صاحب زاہدہ کو بازو سے پکڑ کر باہر نکال دیں گے۔ زاہدہ کی آواز غصیلی اور پہلے سے زیادہ جذباتی ہوتی جا رہی تھی۔ میرے والد صاحب کی ہلکی سی، "ہوں"، اور "ہاں"، بھی نہیں سنائی دے رہی تھی۔

زاہدہ نے کہا ——— "آپ تاریخ پڑھ لیں۔ قوم کو جب بھی شکست ہوئی ہے آپ جیسے غداروں کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ آپ جیسے مسلمانوں نے اپنی بیٹیوں کو "کفار" کے ہاتھوں بے آبرو کرایا ہے۔ خدا آپ کو کبھی نہیں بخشے گا" ———

اور زاہدہ تڑاخ تڑاخ قدم اٹھاتی کمرے سے نکلی اور چلی گئی۔ میں دروازے سے ہٹ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔

والد صاحب میرے کمرے میں آ گئے۔

"جبار!" ——— والد صاحب نے مجھ سے پوچھا ——— "یہ لڑکی کون ہے اور تمہیں کس طرح جانتی ہے"؟

"کون سی لڑکی اباجی؟" ——— میں نے اُٹھ کر انجان بنتے ہوئے کہا۔

——— "میں تو سویا ہوا تھا۔"

"تمہاری بہنیں اسے جانتی ہیں" ——— والد صاحب نے کہا ———

"اس کا نام زاہدہ ہے۔"

میں نے والد صاحب کو بتایا کہ زاہدہ کون ہے اور وہ کیا کرتی ہے۔ میں نے تفصیل سے بتا کر یہ بھی کہہ دیا ——— "آپ اس کے والد صاحب سے ملیں۔ وہ اپنی اس بیٹی کا نام فخر سے لیا کرتے ہیں۔ اسے تحریک میں شامل ہونے سے نہیں روکتے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔"

"ایسی بیٹی پر باپ کو فخر ہی کرنا چاہیئے" ——— والد صاحب نے کہا۔ میں حیرت سے والد صاحب کو دیکھنے لگا۔ وہ فوجی انداز سے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ وہ رُک گئے اور میری طرف دیکھ کر فوجی لہجے میں بولے "جبّار! تم اپنا کام جاری رکھو۔"

"کون سا کام اباجی"؟

"یہی جو تم باہر جا کر کیا کرتے تھے" ——— والد صاحب نے کہا ——— "اس لڑکی نے میرے ایمان کو جگا دیا ہے۔ تم جلسوں اور جلوسوں میں جایا کرو" اُن کے یہ الفاظ مجھے ساری عمر یاد رہیں گے۔ انہوں نے کہا ——— "میں نے گیدڑوں کی طرح عمر گزار دی ہے۔ میں تمہیں گیدڑ نہیں بننے دوں گا۔ جاؤ، شیر بن کر دکھاؤ۔"

والد صاحب جذبات میں آ گئے تھے۔ یہ زاہدہ کی کرامت تھی۔ انہیں ابھی پوری طرح علم نہیں تھا کہ قوم کی سرگرمیاں اور مقاصد کیا ہیں۔ یہ میں نے انہیں بعد میں بتا دیئے تھے لیکن اُس روز زاہدہ ان کے صرف جذبات کو بھڑکا گئی تھی۔ زاہدہ کھُلتے ہوئے گندمی رنگ کی لڑکی تھی۔ یہ رنگ کبھی سفیدی مائل ہو جایا کرتا تھا۔ اس کے نقوش تیکھے تھے اور اس کی آنکھوں میں جادو کا سا تاثر تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کی آنکھیں انسان پر ہپناٹزم کا سا اثر کرتی تھیں۔ دانت زیادہ ہی چمکیلے تھے اور اس کے ہونٹوں پر قدرتی مسکراہٹ رہتی تھی۔ زندہ مزاج لڑکی تھی۔ بدن چھریرا اور پھرتیلا اور وہ ذہنی طور پر چُست اور ہوشیار تھی۔ ہنسی مذاق کے موڈ میں ہو تو وہ اجڈ سی دیہاتن لگتی تھی، لیکن تقریر کرنے کھڑی ہوتی تھی تو ہجوم کو سُن کر دیتی تھی۔ اس کے ساتھ کئی اور لڑکیاں تھیں۔ سب میں زاہدہ جیسے اوصاف تھے۔ آج ہر لڑکی گمنام مجاہدہ ہے۔ پاکستان کی تاریخ انہیں کبھی بھی نہیں جان پہچان سکے گی۔

جب سے آپ نے "حکایت" میں "طاہرہ" نام کا ایک ناول قسط وار

شائع کرنا شروع کیا ہے، میرے ذہن میں ناول کی مرکزی کردار، طاہرہ کا تصوّر
زاہدہ کا سراپا بن گیا ہے۔ کئی بار خیال آیا کہ آپ سے پوچھوں کہ آپ نے امرتسر
میں زاہدہ کو تو نہیں دیکھ لیا تھا؟ میں جو تحریک پاکستان کے ہنگامہ خیز دور کا مجاہد
ہوں، وثوق سے کہتا ہوں کہ طاہرہ کا کردار فرضی نہیں ہو سکتا۔ اگر میں ناول نویس
ہوتا تو زاہدہ کی شکل وصورت، سیرت اور کارناموں کو "طاہرہ" کے مصنف
کی طرح موتیوں جیسے الفاظ میں بیان کرتا۔

میں پھر سے تحریک کے ہنگاموں میں شامل ہو گیا۔ والد صاحب نے دلچسپی
سے پوچھا کہ یہ تحریک کیا ہے اور لائحہ عمل کیا ہے۔ میں نے انہیں بتا دیا۔

دو روز بعد وہی دو ہندو لیڈر اور ایک سکھ ہمارے گھر آئے۔ ان کے ساتھ
سکھ تھانیدار نہیں تھا۔ ایک ہندو لیڈر نے بات شروع کی۔ کہنے لگا —— "آپ
کے بیٹے کو ہم نے پھر جلوسوں کے ساتھ بھاگتے دوڑتے دیکھا ہے۔ یہ گرفتار ہو
جائے گا اور آپ کو معلوم ہے کہ آپ کو کیا کیا نقصان پہنچے گا۔"

والد صاحب نے مجھے حیران کر دیا۔ انہوں نے اس ہندو کو اس سے آگے
نہ بولنے دیا۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور تحمل سے بولے —— "لالہ جی! میں آپ کا
بہت مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے بتا دیا ہے کہ مجھے کیا کیا نقصان اٹھانا پڑے گا،
لیکن میں اپنے آپ کو اور اپنے بیٹے کو قوم سے الگ نہیں کر سکتا۔ جاپانیوں نے
مجھے مارنے کی بہت کوشش کی تھی۔ میں ان کی گولی سے بچ بھی نہیں سکا لیکن
مرا بھی نہیں۔ میں اگر انگریزوں کے لیے گولی کھا سکتا ہوں تو اپنی قوم کے لیے ہم
باپ بیٹا اکٹھے گولی کھائیں گے۔ میں اپنے بیٹے کو نہیں روکوں گا۔ سرکار سے کہہ
دو کہ میری پنشن روک لے" —— اس کے بعد والد صاحب نے ان کی جو
توہین کی، اسے یہ ہندو اور سکھ ساری عمر نہیں بھولیں گے۔ والد صاحب نے
کہا —— "آپ میرے گھر سے تشریف لے جائیں۔ یہاں کے مسلمانوں کو
پتہ چل گیا کہ میرے گھر میں ہندو اور سکھ آتے ہیں تو میری بے عزتی ہو جائے گی۔"

بے شک میں نے والد صاحب کو اچھی طرح ذہن نشین کرایا تھا کہ ہماری
تحریک کا مقصد اور ہمارا پروگرام کیا ہے لیکن میں اسے زاہدہ کا کارنامہ کہوں گا
کہ والد صاحب کے خیالات بدل گئے تھے، میرے والد صاحب کے خیالات میں
اسی نے انقلاب بپا کیا تھا۔ ان ہندوؤں اور سکھ لیڈروں نے یہ سلوک کر کے والد
صاحب نے مجھے شیر بنا دیا۔ زاہدہ مجھ سے پوچھا کرتی تھی کہ اب ابا جی روکتے تو
نہیں؟ زاہدہ نے کئی پتھروں کو موم کیا اور دبی ہوئی چنگاریوں کو شعلہ بنایا تھا۔

ٹوانہ وزارت کے خلاف جو ہنگامہ خیز تحریک چلی تھی، اس کا مرکز لاہور تھا۔
حکومت مظاہرین پر دل کھول کر تشدد کر رہی تھی۔ ایک روز ہمیں امرتسر میں اطلاع
ملی کہ لاہور مال روڈ پر عورتوں کے جلوس پر آنسو گیس پھینکی گئی اور لاٹھی چارج بھی کیا گیا
ہے۔ کئی عورتوں کو پولیس نے گھسیٹ گھسیٹ کر لاریوں میں پھینکا اور انہیں لے گئے۔

اُن دنوں پنجاب کے اخباروں پر سنسر عائد تھا۔ ان جلوسوں اور مظاہروں
کی کوئی خبر یا تصویر شائع نہیں کی جا سکتی تھی پھر بھی خبریں ہر جگہ پہنچا دی جاتی تھیں۔
یہ مسلم لیگ کے ورکروں کا انتظام تھا۔ وہ خبرنامہ سائیکلو سٹائل کر کے دستی ہر شہر
اور قصبے میں پہنچا دیا کرتے تھے۔ صوبے کے باہر کے مسلمان اخبار یہ خبریں چھاپ
دیا کرتے تھے۔

امرتسر لاہور سے دُور نہیں تھا۔ لاہور کی خبر اُسی رات امرتسر پہنچ جاتی تھی۔
اب لاہور سے خبر آئی کہ عورتوں کے جلوس پر پولیس نے تشدد کیا ہے تو امرتسر کے
مسلمان آگ بگولہ ہو گئے۔ ہم سب نعرے لگانے لگے —— "لاہور چلو۔ لاہور
چلو" —— مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ ہمیں مسلم لیگ کے مقامی دفتر سے لاہور جانے
کا حکم ملا تھا یا ہم نوجوانی کے جوش میں خود ہی لاہور کو چل پڑے تھے۔ اُس وقت
کے نوجوان ڈسپلن اور احکام کے اس قدر پابند رہتے تھے کہ از خود کارروائی کرنے
کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی۔ شاید ہمیں کسی لیڈر نے ہی حکم دیا تھا کہ لاہور میں
پولیس نے خواتین پر تشدد کیا ہے۔ اس کے جواب میں اس سے زیادہ ہنگامہ خیز

کارروائی کی جائے۔

اُن دنوں لاہور میدانِ جنگ بنا ہوا تھا۔ سرکاری عمارتوں اور دفتروں پر مسلم لیگ کے جھنڈے چڑھائے جا رہے تھے۔ لاہور کی فضا آنسو گیس سے بوجھل اور اشک بار رہتی تھی۔ سڑکوں پر خون عام سی بات بن گئی تھی۔ نوجوان لاپتہ ہو رہے تھے۔ جیلیں نوجوانوں سے اَٹ گئی تھیں۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ انگریز مل کی حکومت کے پاؤں اُکھڑ رہے ہیں۔ فرنگی قدم جمانے کے لیے تشدد میں بے رحمی سے اضافہ کر رہا تھا۔ ہندو لیڈروں کا یہ دعویٰ پارہ پارہ ہو چکا تھا کہ ہندوستانی ایک قوم ہے اور مسلمان الگ قوم نہیں۔ مسلمانوں نے قہر و غضب سے اور خون کے نذرانوں سے ثابت کر دیا تھا کہ ہندوستان میں مسلمان الگ قوم ہیں اور اسی ملک میں الگ مملکت بنا کر رہیں گے۔

ہم کم و بیش چالیس نوجوان تھے، جو دو بزرگوں کی قیادت میں صبح کے وقت لاہور پہنچ گئے۔ ہمارے ساتھ دس بارہ لڑکیاں تھیں جن میں زاہدہ بھی تھی۔ یہ زاہدہ کا جانباز گروہ تھا۔ ہمارے دو بزرگ قائدین نے لاہور مسلم لیگ سے جلوس کا پروگرام پوچھا اور احکام لیے۔ ہم جو نوجوان تھے، لاہور کے نوجوانوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف رہے، لیکن ہم ایک دوسرے سے تازہ فلموں اور لذیذ ناولوں کے متعلق نہیں پوچھ رہے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے کپڑوں کو نہیں دیکھ رہے تھے کہ لاہور کا فیشن کیا ہے۔ ہم ٹوانہ وزارت کو اکھاڑنے، اس کے بعد انگریزوں کے خلاف شدید اقدامات کرنے اور زیادہ سے زیادہ قربانیاں دینے کی باتیں کر رہے تھے۔

وہاں دو نوجوان تھے جو کالج کے طلبہ تھے۔ میں ان کے نام نہیں جانتا انہوں نے بتایا کہ انہوں نے جانبازوں کا ایک گروہ تیار کر لیا ہے جو (اگر پاکستان کا مطالبہ تسلیم نہ ہوا تو) گوریلا آپریشن شروع کر دیں گے۔ انہوں نے اس عزم کا اظہار جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں کیا تھا۔ یہ باقاعدہ پلان تھا۔ ان نوجوانوں کو کہیں درپردہ

گوریلا ٹریننگ مل رہی تھی۔ ہتھیاروں اور ڈائنامیٹ کے لیے انہیں مسلمان فوجیوں نے یقین دلا دیا تھا کہ چُرا کر دے دیں گے۔ سرحد کے قبائلی علاقے سے رائفلوں کا انتظام بھی کر لیا گیا تھا۔ قبائلی لیڈروں نے تجربہ کار پٹھان گوریلے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔

ہم نے جو امرتسر سے آئے تھے اس پلان میں شامل ہونے کی پیش کش کی۔ لاہور کے لڑکوں نے بتایا کہ اس جانباز گروہ میں ہر کسی کو شامل نہیں کیا جائے گا۔ اس کے لیے تربیت یافتہ نوجوانوں کو شامل کیا جا رہا تھا اور ایسے نوجوانوں کو جو ٹھنڈے مزاج کے ہوں اور جذبات کے زیرِ اثر بھڑک اُٹھنے والے نہ ہوں۔ یہ زندگی اور موت کی جنگ تھی جو عقل اور ٹھنڈے دل سے مگر جان ہتھیلی پہ رکھ کر لڑنی تھی۔

یہ تو بڑی لمبی باتیں ہیں۔ یاد آتی ہیں تو کہیں ختم ہوتی نظر نہیں آتیں۔ آج کے نوجوانوں کو اُس دور کے جذبے اور واقعات کا علم ہونا چاہیے۔ ہماری نسبت آج کے نوجوانوں پر زیادہ نازک اور پُرخطر ذمہ داریاں عائد ہو گئی ہیں۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ ہمارے بچے ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں گے یا نہیں۔

میں اُس روز کا واقعہ سنا رہا تھا، جب ہم لاہور آئے تھے۔ دن کے پچھلے پہر بہت بڑے جلوس کا پروگرام تھا۔ ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ جلوس کا پروگرام کیا ہے۔ صرف لیڈروں اور منتظمین کو معلوم تھا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ بہت بڑے حملے کا انداز نظر آ رہا تھا۔ جلوس کے آگے آگے سروں کو جھٹکے دے دے کر کلمہ شریف پڑھنے والوں نے ایسا تاثر پیدا کر دیا تھا جیسے ہم سب واپس نہ آنے کے لیے جا رہے ہوں۔ جلوس میں لڑکیاں بھی تھیں جن کے اردگرد کالجوں کے طلبہ اور مسلم لیگ نیشنل گارڈ نے حصار کھینچ رکھا تھا۔ خواتین کے یہ محافظ پولیس سے بھی ٹکرا جایا کرتے اور جان کی بازی لگا کر لڑکیوں کی حفاظت کرتے تھے۔

جلوس سیکرٹریٹ کے سامنے جا پہنچا جہاں پولیس کی بے انداز نفری نے مورچہ بندی کر رکھی تھی۔ ان میں لاٹھیوں سے مسلّح نفری بھی تھی۔ رائفلوں سے مسلح بھی اور گیس کے گولے پھینکنے والی نفری الگ تیار کھڑی تھی۔ آپ کو معلوم

ہے کہ سیکرٹریٹ میں وزیروں کے دفتروں کے علاوہ گورنر کا دفتر بھی ایسا ہی اہم تھا جیسے پورے برطانیہ کا دفاع۔

اچانک جلوس کے ہراول نے سیکرٹریٹ کے گیٹ پر ہلّہ بول دیا۔ گیٹ بند تھا۔ اُس وقت بھی یہ گیٹ ایسا ہی تھا جیسا آج ہے۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں گیٹ پر چڑھ رہی تھیں۔ پھر انہوں نے گیٹ کھول دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میدانِ جنگ میں لڑے جانے والے فوجی معرکے کی صورت تھی۔ دھماکے تھے اور اللہ اکبر کے نعرے۔ گیس کے گولے فائر ہو رہے تھے۔ ان میں شاید رائفلوں کے دھماکے بھی تھے۔ مسلمان بڑھ بڑھ کر سیکرٹریٹ پر ہلّہ بولتے تھے۔ بہت سے لوگ اندر چلے گئے تھے۔ یہ غالباً وہی دن تھا جس دن گورنر کے دفتر پر کسی لڑکی نے سبز پرچم چڑھا دیا تھا۔ میں وثوق سے نہیں بتا سکتا کہ پرچم چڑھانے والی لڑکی کون تھی۔ وہاں کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔

آنسو گیس اِس قدر زیادہ پھینکی گئی کہ اس کے بادلوں میں کچھ نظر نہیں آتا تھا اور آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ میں نے کئی نوجوانوں کو گرتے بھی دیکھا تھا۔ میں ابھی گیٹ کے اندر نہیں گیا تھا۔ مجھے اپنے امرتسری ساتھیوں کا کچھ پتہ نہیں تھا کہاں ہیں۔ مَیں گیس سے اندھی کی ہوئی اور پانی بہاتی ہوئی آنکھوں سے گیٹ کی سمت کا اندازہ کر کے تیز چل پڑا، میری پیٹھ پہ گردن کے ساتھ اتنی زور سے لاٹھی پڑی کہ میں چکرا گیا۔ میں نے نیم آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن ایسا چکر آیا کہ میں گر پڑا۔ میں بے ہوش ہو چکا تھا۔ بے ہوش ہونے سے ایک دو سیکنڈ پہلے میں نے محسوس کیا تھا جیسے کسی نے مجھے بازو سے پکڑ کر گھسیٹا ہو۔ یہ پولیس کا ہی ہاتھ ہو سکتا تھا۔ مجھے اب جیل میں بند ہونا یا پولیس کے تشدد سے ہمیشہ کے لیے ختم ہونا تھا۔

ہوش ٹھکانے آئے تو میں ایک کمرے میں پلنگ پر پڑا تھا۔ سب سے پہلے نظر چھت پر پڑی جسے میں کسی تھانے کی حوالات کی چھت سمجھا۔ یہ

جیل خانہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے اپنے پاس آوازیں سنائی دیں۔ میں نے دیکھا دو آدمی میرے قریب بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میری کھلی ہوئی آنکھیں دیکھ کر مجھ سے پوچھنے لگے کہ میں کیسا ہوں؟

میری گردن اور کندھے اکڑ گئے تھے۔ یہ لاٹھی کے آہنی حصے کی ضرب تھی جس نے ریڑھ کی ہڈی کو سُن کر دیا تھا۔ مَیں ان سے پوچھ بھی نہ سکا تھا کہ وہ کون ہیں اور میں کہاں ہوں کہ دروازہ کھلا اور زاہدہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ امرتسر کی تین لڑکیاں تھیں۔ زاہدہ نے مجھ سے حال پوچھا۔ میں نے بتایا۔ مجھے بے ہوشی میں ایک ڈاکٹر دیکھ گیا تھا۔

مختصر یہ کہ میں جب لاٹھی کی ضرب سے گرا تھا تو زاہدہ دو لڑکیوں کے ساتھ کہیں قریب ہی تھی اور ان لڑکیوں نے مجھے اتفاق سے دیکھ لیا۔ بے ہوشی سے پہلے مجھے گھسیٹنے والا ہاتھ زاہدہ کا تھا۔ ان تین لڑکیوں نے مجھے وہاں سے گھسیٹا، کچھ اٹھایا، پھر لاہور کے دو تین لڑکے اُن کے ساتھ مل گئے اور اس طرح مجھے میدانِ جنگ سے محفوظ مقام کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ صرف مجھے ہی وہاں سے نہیں اٹھایا گیا۔ لڑکیوں اور لڑکوں نے اسی طرح زخمی اور بے ہوش لڑکیوں اور لڑکوں کو اٹھایا تھا مگر ایسے زخمی بھی تھے جنہیں پولیس اٹھا لے گئی تھی۔

مجھے یہ دو حضرات جو میرے پاس بیٹھے تھے اپنے گھر لے گئے تھے۔ یہ مکان پرانی انارکلی میں بالائی منزل پہ تھا۔ میں آج تک اِن دو حضرات کو ڈھونڈھ رہا ہوں۔ مجھے نہیں مل سکے۔ وہ غالباً کرایہ دار تھے۔ مکان تو موجود ہے مگر وہاں (پاکستان بننے کے بعد) کوئی اور خاندان آ گیا تھا۔

زاہدہ اور اس کی سہیلیوں کی آنکھیں آنسو گیس سے سوجی ہوئی تھیں تینوں کے بال بکھرے ہوئے اور ایک کی قمیض پھٹی ہوئی تھی۔ اسے پولیس نے پکڑ لیا تھا۔ لاہور کے تین چار لڑکوں نے اسے کانسٹیبلوں سے چھینا تھا۔ اس میں ایک لڑکا زخمی ہو گیا تھا۔ میں خاصی زیادہ تکلیف میں تھا۔

ہم دوسرے دن ریل گاڑی سے امرتسر پہنچے ۔ تمام لڑکے اور لڑکیاں آ گئے تھے ۔ سب کی حالت بالکل ایسی تھی جیسے محاذ سے آئے ہوں ۔ آنکھیں سب کی سُوجی ہوئی تھیں ۔ زاہدہ اور اس کی ان دو سہیلیوں کی آنکھیں جنہوں نے مجھے اٹھایا اور محفوظ مقام تک پہنچایا تھا، اگلے روز سوجن اور جلن سے تقریباً بند ہو گئی تھیں ۔ وہ دوسرے دن بھی کھانس رہی تھیں ۔ گیس کا زیادہ تر حصہ انہوں نے وصول کیا تھا ۔

یہ تھیں جنگِ آزادی کی معرکہ آرائیاں ۔ آج ہم کسی کو سناتے جھینپ جاتے ہیں ۔ آج کی نسل انہیں افسانے سمجھتی ہے ۔

میرے والد صاحب نے مجھے دیکھا تو باپ کی حیثیت سے وہ فکر مند ہوئے، پریشان ہوئے لیکن امرتسر کے مسلمان کی حیثیت سے ان کا رویّہ وہی تھا جو امرتسر کے دوسرے مسلمانوں کا تھا ۔ ان کے جذبے اُمڈ آئے اور والد صاحب خود بھی تحریک کی سرگرمیوں میں شامل ہونے کو تیار ہو گئے مگر ہمارے لیے (میرے ، زاہدہ اور اس کی سہیلیوں کے لیے) لاہور کا معرکہ آخری معرکہ ثابت ہوا ۔ مجھے کندھوں کی چوٹ نے اور ان لڑکیوں کو گیس زدہ آنکھوں اور پھیپھڑوں نے کئی روز اُٹھنے نہ دیا ۔ ہم میدان میں آنے کے قابل ہوئے تو یہ خوشخبری سنی کہ ہم نے فتح حاصل کر لی ہے اور خضر حیات ٹوانہ کی وزارت مستعفی ہو گئی ہے ۔

ہماری جنگ اس انگریز نواز وزارت کے استعفے پر ختم ہونے والی نہیں تھی ۔ ہمارا عزم اپنی آزاد مملکت کا حصول تھا لیکن اس وزارت کو جس طرح قوم نے توڑا تھا اس سے انگریز کی کمر ٹوٹ گئی ۔ انگریز، ہندو اور سکھ قائل ہو گئے کہ اس قوم کے مطالبے کو ردّ کرنا ممکن نہیں ۔ کہاں ہندو مسلمانوں کو محکوم بنانے کے خواب دیکھ رہا تھا ۔

جس روز ٹوانہ کا تختہ اُلٹ گیا اس سے اگلے روز ہمیں امرتسر میں اطلاع ملی کہ سکھوں کے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے لاہور اسمبلی ہال کے سامنے کھڑے ہو کر کرپان

نیام سے نکالی اور کرپان لہرا کر کہا ——— "پاکستان کا فیصلہ میری کرپان کرے گی" ——— یہ ایک سکھ کی گیدڑ بھبکی یا کھوکھلی دھمکی نہیں تھی سکھ مسلمانوں کے خلاف کھلی جنگ لڑنے کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے ۔ مسلمان بھی تیار تھے مگر مسلمان نہتے تھے ۔ انہیں سرکار نے بالکل ہی نہتہ اس طرح کر دیا کہ آئے دن مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی ہونے لگی ۔

میں امرتسر کی بات کر رہا ہوں ۔ مجھے معلوم نہیں دوسرے شہروں میں کیا ہو رہا تھا ۔ ہر سکھ کو اپنے ساتھ کرپان رکھنے کی اجازت تھی کیونکہ کرپان لٹکائے پھرنا ان کا مذہبی فریضہ ہے ۔ مسلمانوں کو چھوٹا سا چاقو رکھنے کی بھی اجازت نہیں تھی ۔ یوں کہہ لیں کہ سکھوں اور ہندوؤں کو انگریزوں کی پشت پناہی حاصل تھی ۔ ان حالات میں سکھ جو جنگ لڑنا چاہتے تھے وہ مسلمانوں کا قتلِ عام بن گیا ۔

امرتسر میں مسلمانوں کے قتل کی اکّا دکّا وارداتیں ہونے لگیں ۔ جہاں کہیں سکھوں کو کوئی مسلمان مل جاتا اُسے قتل کر دیتے ۔ پولیس رپورٹ رجسٹر نہیں کرتی تھی ۔ ہم لوگوں نے جوابی کارروائی شروع کر دی ۔ رات کو ہم گلیوں میں نکل جاتے ۔ کوئی قسمت کا مارا اکیلا سکھ مل جاتا تو اُسے قتل کر دیتے ۔ دونوں طرف قتل کی وارداتیں بڑھنے لگیں ۔ سرکاری حکم جاری ہوا کہ جس محلے میں دوسرے فریق کا کوئی آدمی قتل ہو گا اُس سارے محلے سے جُرمانہ وصول کیا جائے گا ۔

ہم نے اس کا یہ علاج کیا کہ اپنے محلّے سے گزرتے ہوئے کسی سکھ کو قتل کرتے اور لاش اٹھا کر ہندوؤں کے محلّے میں پھینک آتے ۔ اس کا جُرمانہ ہندوؤں کے محلّے سے وصول کیا جاتا ۔ زیادہ تر مقتول مسلمان تھے ۔ اس پر ظلم یہ کہ صرف مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی ہوتی ۔ اس تلاشی کا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی مسلمان کے ہاں کوئی ہتھیار نہ رہے ۔

شہر میں بعض جگہوں پر کھلی لڑائیاں بھی ہوئیں اور گرفتار صرف مسلمان ہوئے ۔ اب لڑکیوں کا کام ختم ہو گیا تھا ۔ ہم ان کے گھروں کی حفاظت کیا کرتے تھے ۔

ہم جانتے تھے کہ سکھوں کی نظریں ان لڑکیوں پر جمی ہوئی ہیں۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کے روز ہندوستان کے مسلمانوں نے آخری فتح حاصل کرلی۔ ملک کی تقسیم کا اعلان ہوگیا۔ سرحدوں کا تعین، سامان اور سرکاری خزانے کی تقسیم کا کام شروع ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی امرتسر گلیوں کی لڑائی کا میدانِ جنگ بن گیا۔ نہتہ ہونے کی وجہ سے نقصان مسلمانوں کا زیادہ ہو رہا تھا، لیکن کہیں بھی مسلمانوں نے پیٹھ نہیں دکھائی۔ میں بہت سے ایسے معرکے سنا سکتا ہوں لیکن اصل کہانی رہ جائے گی۔ صرف چوک پراگ داس کا معرکہ سنا دیتا ہوں۔

چوک پراگ داس میں ایک مسجد تھی جس کے اردگرد مسلمانوں کے چند ایک گھر تھے۔ باقی تمام محلہ ہندوؤں کا تھا۔ کچھ سکھوں کے گھر بھی تھے۔ ایک رات ہندوؤں اور سکھوں نے ان مسلمان گھروں پر حملہ کردیا۔ کسی عورت اور بچے کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ شہیدوں کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ تھی۔ شہر میں فوج بھی تھی۔ فوجی افسروں سے مل کر اس محلے سے شہیدوں کی لاشیں اٹھائیں۔ ایک ہی بار ایک سو جنازے اُٹھے۔ یہ سب پاکستان کے نام پر شہید ہوئے تھے۔ آج وہ دشمن کی زمین میں دفن ہیں اور تاریخ ان سے بے خبر ہے۔

مسلمانوں نے جوابی حملے کا پلان بنایا۔ ہم کوئی ہتھیار نہیں اُٹھا سکتے تھے۔ فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ جمعہ کی نماز چوک پراگ داس کی مسجد میں پڑھی جائے گی۔ مسلمانوں نے زبانی زبانی ہر مسلمان گھر میں یہ ہدایت پہنچا دی کہ نماز کے لیے جو بھی آئے مٹی کا لوٹا ساتھ لائے۔ وضو کے لیے پانی سے بھرا ہوا لوٹا ساتھ رکھنا کوئی جرم نہیں تھا۔

مسلمان مٹی کے لوٹے اٹھاتے مسجد میں پہنچ گئے۔ فوج بھی پہنچ گئی۔ فوج کو شاید علم ہوگیا تھا کہ مسلمان جو لوٹے لے کے جا رہے ہیں، یہ وضو کے لیے نہیں بلکہ یہ ہتھیار کے طور پر استعمال ہوں گے۔ لوٹوں کی حقیقت یہی تھی بعض

مسلمان لوٹوں میں جو پانی لے گئے تھے اس میں انہوں نے پسی ہوئی لال مرچیں ملائی تھیں۔ مسلمان کھلی جنگ کے لیے چوک پراگ داس میں اکٹھے ہوئے تھے۔ نماز پڑھ کر ہم باہر نکلے اور نعروں کی زبان میں سکھوں کو للکارا۔ سکھ تیار تھے۔ انہوں نے کرپانوں سے حملہ کردیا۔ مسلمانوں نے لوٹوں سے مقابلہ کیا۔ فوج پہلے تو تماشا دیکھتی رہی۔ فوجی افسروں کو توقع تھی کہ مسلمانوں کا نقصان زیادہ ہوگا لیکن دیکھا کہ مسلمانوں کے لوٹوں کی ضربوں سے سکھ گرنے لگے ہیں اور گرنے والے سکھوں کی کرپانیں مسلمانوں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہیں تو فوج نے مداخلت کی جس کا نشانہ مسلمان بنے۔ البتہ سکھوں پر واضح ہوگیا کہ اسلام کے بے تیغ سپاہی لوٹوں سے بھی لڑ سکتے ہیں، اور انہیں اتنی آسانی سے شکست نہیں دی جاسکتی جیسا کہ سکھوں کو توقع تھی۔

جوں جوں آزادی کا دن قریب آتا جا رہا تھا، مسلمانوں پر سکھوں کے حملے بڑھتے جا رہے تھے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک امرتسر مسلمانوں کے خون سے لال ہوگیا تھا۔ مسلمان شریف پورہ کے پناہ گزین کیمپ میں کنبہ در کنبہ جمع ہو رہے تھے۔ اس کیمپ کی حفاظت مرہٹہ رجمنٹ کے سپرد تھی۔ کیمپ میں شہر اور مضافات کے لاکھوں پناہ گزین جمع ہو چکے تھے۔ ہم نوجوان اُن کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

ہمیں پتہ چلا کہ مرہٹہ رجمنٹ پناہ گزینوں کو ختم کرنے کا پروگرام بنائے ہوئے ہے۔ ریاست پٹیالہ کی فوج بھی آگئی جس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں یہاں تک علم ہوگیا کہ حملہ کس رات کو ہوگا۔ چند ایک بزرگ مسلمان انگریز افسروں کے پاس گئے اور انہیں فوج کے عزائم سے آگاہ کیا اور درخواست کی کہ کیمپ کی حفاظت کے لیے مسلمان فوجی بلائے جائیں۔ کسی دردمند انگریز فوجی افسر نے درخواست پر توجہ دی اور بلوچ رجمنٹ کی مسلمان کمپنیوں کو کیمپ کی حفاظت کی ڈیوٹی دے دی اور مرہٹہ رجمنٹ کو وہاں سے ہٹا دیا۔ ہماری اس بلوچ

رجمنٹ نے مہاجرین کو پاکستان تک پہنچانے کی مہم میں جو دلیرانہ کردار ادا کیا تھا وہ ہماری فوج کی تاریخ کا قابلِ فخر باب ہے۔

یہ داستان چند صفحوں میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ میں اپنی اور زاہدہ کی کہانی پر آتا ہوں۔

کیمپ میں زاہدہ سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وہ اپنے کنبے کے ساتھ تھی جس میں اس کے والد صاحب، دو چھوٹے بھائی، ایک بہن اور والدہ تھیں۔ اس کی بہن کی عمر سولہ سترہ سال تھی۔ بھائی اس سے بھی چھوٹے تھے۔ زاہدہ کیمپ میں دوسرے پناہ گزین کنبوں کی دیکھ بھال اور حوصلہ افزائی میں لگی رہتی تھی۔ ہم نے پہلا یوم آزادی اسی کیمپ میں منایا۔ نعروں سے ہمارے سینے پھٹے جاتے تھے۔ ہم دیکھ نہ سکے کہ پاکستان میں آزادی کا پہلا دن کس طرح منایا گیا تھا۔

میں ۱۴ اگست کی صبح زاہدہ کو مبارک دینے جا رہا تھا۔ وہ سامنے سے آرہی تھی۔ مجھے دیکھ کر دوڑ پڑی اور لوگوں کے ہجوم میں مجھ سے بغل گیر ہوگئی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بازوؤں میں جکڑے رکھا۔ مجھے زاہدہ کی سسکیاں سنائی دیں۔ وہ رو رہی تھی۔ یہ خوشی کا رونا تھا اور یہ جذبات کی شدت کی انتہا تھی۔

اس کے بعد میں زاہدہ کو نہ دیکھ سکا۔ ہم کیمپ سے پاکستان کو روانہ ہوگئے۔ یہ سفر کیسا تھا؟ بڑی لمبی اور جانکاہ روئیداد ہے۔ جو قافلے بلوچ رجمنٹ کی حفاظت میں آتے تھے وہ خیریت سے لاہور پہنچ جاتے تھے، اور جو از خود چل پڑے وہ لاشوں اور زخمیوں کے قافلے بن گئے۔

ہم لاہور پہنچ گئے۔ نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ ٹھکانہ مل گیا۔ روزگار بھی مل گیا۔ والد صاحب کو زمین مل گئی اور چند سالوں میں ہم امرتسر سے بہتر زندگی بسر کرنے لگے۔ پھر میری شادی ہوئی۔ والد صاحب فوت ہوگئے۔ میری بہنیں

بھی بیاہی گئیں۔ ہماری اگلی نسل پیدا ہونے لگی جو آج جوان ہے اور میں والد صاحب کی طرح بوڑھا ہوگیا ہوں۔

اس سال (۱۹۷۷ء) کے اُن دنوں کا ذکر ہے جب کالجوں کے داخلے ہو رہے تھے۔ میری بیٹی نے داخلہ لے لیا۔ ایک روز میرے کمرے میں آئی کہنے لگی ——— "اباجان! ایک لڑکی نے میرے ساتھ میٹرک کیا ہے۔ پڑھنے کا اسے بہت شوق ہے لیکن غربت کی وجہ سے آگے نہیں پڑھ سکتی اگر داخلہ فیس آپ دے دیں تو ہم بہت سی لڑکیاں اس کی فیس ہر ماہ ادا کرتی رہیں گی"۔

اپنی بچی کا یہ جذبہ مجھے پسند آیا۔ میں اس کی حوصلہ شکنی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ اسے لے آنا، میں داخلہ فیس اور ابتدائی فیس دے دوں گا۔ میری بیٹی نے بتایا کہ وہ ہمارے گھر میں بیٹھی ہے۔ وہ خوشی سے دوڑتی گئی اور اس لڑکی کو میرے کمرے میں لے آئی۔

میں نے اس لڑکی کو دیکھا تو اچھل کر اُٹھا۔ میرے مُنہ سے نکلا ——— "زاہدہ"!

وہ زاہدہ ہی تھی۔ وہی آنکھیں، وہی چہرہ، ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ۔ چہرے کے خدوخال زاہدہ کے تھے۔ تیس سال گزر جانے کے بعد بھی زاہدہ بوڑھی نہیں ہوئی تھی۔ اب زاہدہ کی عمر کم و بیش پچاس سال ہونی چاہیے تھی۔ دو تین سیکنڈ کے لیے تو میرا دماغ ماؤف سا ہوگیا۔ میرے مُنہ سے زاہدہ کا نام سن کر میری بیٹی اور یہ لڑکی مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اپنی حماقت پر قابو پالیا۔

"تمہاری ماں کا نام کیا ہے؟" میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"زاہدہ" لڑکی نے جواب دیا۔

"ماں نے کبھی تمہیں بتایا ہے کہ وہ امرتسر کی رہنے والی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"جی" لڑکی نے جواب دیا۔ "وہ ہمیں امرتسر کی بہت سی کہانیاں سنایا کرتی ہیں"۔

"تم کہاں رہتی ہو؟"

لڑکی نے ایک احاطے کا نام لیا جس میں ایک ایک دو دو کمروں کے مکانوں میں وہ غریب لوگ رہتے ہیں جو دس پندرہ روپے ماہوار سے زیادہ کرایہ نہیں دے سکتے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ زاہدہ کوئی اور ہوگی۔ وہ احاطوں میں رہنے والی لڑکی نہیں تھی۔ میں نے دل میں دُعا کی کہ یہ زاہدہ کوئی اور ہو۔

مَیں نے لڑکی کے دل سے داخلے کی فیس کا بوجھ اتار دیا۔ یہ مَیں نے اپنے ذمے لے لیا اور اس لڑکی کے ساتھ اس کے گھر کو چل پڑا۔ اپنی بیٹی کو بھی ساتھ لے لیا۔ احاطہ وہاں سے دُور تھا۔ اس میں داخل ہوئے تو گندے گندے بچوں کی ہاؤ ہُو نے استقبال کیا۔ لڑکی نے ایک دروازے کے سامنے لٹکتا ہُوا بوری کا پردہ اٹھایا۔ میں اُس کے پیچھے اندر گیا۔

وہ زاہدہ ہی تھی۔ بال کچھ سفید ہوگئے تھے۔ آنکھوں کا سحر ماند پڑ گیا تھا۔ چہرے پر غربت کی پرچھائیاں تھیں اور اس کے کپڑے بالکل معمولی تھے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو فوراً پہچان لیا۔ اس کا خاوند گھر نہیں تھا۔ تیس سال پہلے شریف پورہ کیمپ میں وہ ۱۴ اگست کی صبح جس طرح مجھ سے بغل گیر ہوئی تھی اُسی طرح دوڑ کر میرے ساتھ لپٹ گئی۔ مَیں نے اسے بازوؤں میں دبوچ لیا ——— اور مجھے اس کی سسکیاں سنائی دیں مگر یہ سسکیاں تیس سال پہلے کی طرح خوشی کی نہیں تھیں۔ وہ جی بھر کے روئی۔

ہم جب ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تو اُس نے آنسو پونچھ کر کہا ——— "باپ نہیں رہا۔ ماں نہیں رہی۔ بھائی نہیں رہے۔ بہن نہیں رہی۔ کس کے گلے لگ کے روتی۔ خدا تمہیں لے آیا ہے۔ تیس سالوں سے رُکے ہوئے آنسو بہہ گئے ہیں" ——— اس نے کہا ——— "جبّار! تم نے محسوس کیا ہوگا کہ پاکستان ہماری منزل تھی مگر منزل بھٹک گئی ہے"۔

"ہاں زاہدہ!" ——— مَیں نے کہا ——— "منزل اپنے مسافروں

کو اور مسافر خضرِ راہ کو ڈھونڈ رہے ہیں"۔

زاہدہ نے امرتسر کے شریف پورہ پناہ گزین کیمپ سے پاکستان پہنچنے تک کی جو تفصیل سُنائی وہ اگر پاکستان کا پرچم سُنے تو سرنگوں ہو جائے۔ زاہدہ کا خاندان اُن بدقسمت خاندانوں میں سے تھا جو گھبرا کر اور کیمپ کی غیر یقینی سی صورتِ حال سے تنگ آ کر اپنے طور پر قافلے کی صورت میں پیدل ہی چل پڑے تھے۔ انہیں بلوچ رجمنٹ کا انتظار کرنا چاہیئے تھا لیکن لاکھوں کے اس بے گھر اور ہراساں ہجوم میں افواہیں جو پھیلتی تھیں، ان سے پناہ گزین اور زیادہ خوفزدہ ہوتے اور ان میں کچھ تعداد بھیڑ بکریوں کی طرح لاہور کو اُٹھ دوڑتی تھی۔ ان میں سے بہت کم ایسے خوش قسمت تھے جو لاہور تک زندہ پہنچے۔

زاہدہ کے قافلے پر سکھوں نے حملہ کر دیا۔ اس کی تفصیل سناتے ہوئے زاہدہ کی آواز تیس سال بعد بھی کانپنے لگی تھی۔ قافلہ کھیتوں میں بکھر گیا۔ زاہدہ کسی جگہ چھپ گئی اور مہاجرین کی چیخ و پکار سنتی رہی۔ اُسے اچھی طرح نظر آیا تھا کہ اس کی چھوٹی بہن کو ایک سکھ کندھے پر ڈالے لے جا رہا تھا۔ پھر رات نے اس خونی منظر پر پردہ ڈال دیا۔ زاہدہ لڑنے سے ڈرنے والی لڑکی نہیں تھی لیکن وہ لڑکی تھی۔ اس نے اپنی بہن کے علاوہ کئی اور لڑکیوں کی چیخیں سُنی تھیں۔ وہ اپنے اس انجام کے ڈر سے چھُپی رہی۔ روتی رہی اور کانپتی رہی۔

دوسرے دن کا سُورج غروب ہو رہا تھا جب زاہدہ پاکستان کی سرحد میں داخل ہوئی۔ اُسے والٹن پناہ گزین کیمپ کو لے جانے لگے تو اس نے یہ وجہ بتا کر جانے سے انکار کر دیا کہ اپنے کنبے کو تلاش کرے گی۔ واہگہ کے قریب قیامت کا منظر تھا۔ مائیں بچوں کو اور بچے ماؤں کو ڈھونڈتے، پکارتے اور روتے پھر رہے تھے۔ زخمی آ رہے تھے، لاشیں آ رہی تھیں۔ لوگ انہیں پہچاننے اور اپنی عزیزوں کو ڈھونڈنے کے لیے لاشوں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ہر کوئی ہر کسی سے کچھ نہ کچھ پوچھ رہا تھا۔

زاہدہ بھی اس ہجوم میں شامل ہوگئی۔ اُسے امرتسر کے کچھ لوگ ملے۔ ان میں سے بعض نے اُسے یقین دلایا کہ اُس کے کنبے کا کوئی ایک بھی فرد زندہ نہیں مگر زاہدہ یقین نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ بھوکی پیاسی آئے ہوئے اور آنے والے قافلوں میں ماری ماری پھرتی رہی۔ اس کا دماغ جواب دے گیا۔ وہ زاہدہ جس نے مجاہدہ بن کر انگریزوں کے خلاف محاذ کو مضبوط کیا تھا، جس نے میرے والد صاحب جیسے فوجیوں کو اسلام کے سپاہی بنا دیا تھا، جس نے لاہور میں سیکرٹریٹ کے معرکے میں زخمیوں کو اٹھایا تھا، وہ زاہدہ پاکستان حاصل کر کے پاکستان میں ایک نیم پاگل لڑکی بن گئی۔ اسے اپنی بہن کا خیال پاگل کئے جارہا تھا جسے ایک سکھ اُٹھا لے گیا تھا۔ وہ تصوروں میں اپنے باپ، ماں اور چھوٹے بھائیوں کی لاشیں دیکھتی رہی۔ یہ لاشیں کبھی اٹھ کھڑی ہوتیں اور اس کی طرف دوڑتی تھیں اور اسے گلے لگاتی تھیں۔

وہ چھ سات مہینے والٹن پناہ گزین کیمپ میں اپنے کنبے کو ڈھونڈتی رہی۔ ایک روز اُسے ایک آدمی ملا جو شہری لگتا تھا۔ اس نے زاہدہ سے حال احوال پوچھا۔ زاہدہ نے اپنا حال اور اپنا دُکھ اُسے بتایا۔ اس آدمی نے اُسے بتایا کہ وہ امرتسر کا رہنے والا ہے اور اس کے والد صاحب کو جانتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کے والد صاحب سنت نگر میں پہنچ گئے ہیں۔

زاہدہ اشارے کی منتظر تھی۔ وہ محسوس ہی نہ کر سکی کہ اس کیمپ میں جہاں لاہور کے باشندے مہاجرین پر جانیں نچھاور کرتے پھر رہے ہیں اور ان کے لئے دیگیں پکوا کر بھیجتے ہیں اور انہیں کپڑے دیتے ہیں، اسی کیمپ میں عصمت فروشوں اور بردہ فروشوں کے ایجنٹ بھی پہنچ گئے ہیں جو اکیلی دکیلی، خوفزدہ مہاجر لڑکیوں کو رشتہ داروں کی سلامتی اور ٹھکانے کا مژدہ سنا کر انہیں اُڑا لے جاتے ہیں۔ زاہدہ بھی خوبصورت لڑکی تھی۔

اس کا دماغ اپنے قبضے میں نہیں تھا۔ وہ اس آدمی کے ساتھ چل پڑی۔ وہ اس محلے کو نہیں پہچان سکی جس کے ایک مکان میں اُسے یہ آدمی لے گیا۔ غیر آباد سا مکان تھا۔ اسے بالائی منزل میں ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ زاہدہ کو اُس وقت شک ہوا

جب یہ آدمی باہر نکلا اور باہر سے چٹخنی چڑھا گیا۔

وہ بہت دیر بعد آیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا۔ زاہدہ نے اُن سے اپنے والد صاحب کے متعلق پوچھا۔ اُسے بتایا گیا کہ یہ نیا آدمی اُسے والد صاحب کے پاس لے جائے گا۔ زاہدہ نے اس آدمی کی نظریں پہچان لیں اور اس کے ساتھ ہی اس کا امرتسر والا تحریک کے دور والا دماغ بیدار ہوگیا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ سکھوں سے تو وہ اپنی عصمت بچا لائی ہے، اب پاکستانی بھائی اس کی عصمت کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔

اس نے گھبراہٹ کا اظہار نہ کیا۔ رات کا وقت تھا۔ نئے آدمی نے اُسے احساس دلایا کہ وہ دنیا میں تنہا رہ گئی ہے، اس لئے اسے اپنے مستقبل کے متعلق ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہئے۔ زاہدہ نے اس آدمی کو بولنے کا موقعہ دیا۔ خاموشی سے سُنتی رہی اور سوچتی رہی کہ ان آدمیوں کے جال سے کس طرح نکل سکتی ہے۔ اس کی خاموشی کو رضا مندی سمجھا گیا یا اسے بالکل ہی کمزور اور بے بس سمجھ لیا گیا۔

بہت دیر باتیں کر کے اس آدمی نے زاہدہ پر بڑے پیارے انداز میں دست درازی شروع کر دی۔ زاہدہ نے یہ اشارہ پا لیا تھا کہ اسے عصمت فروشی کے لئے بیچا اور خریدا جارہا ہے۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور دو چھلانگوں میں دروازے سے نکل گئی۔

زاہدہ جسمانی لحاظ سے پھرتیلی تھی۔ سیڑھیاں اُتر کر بڑے دروازے تک پہنچی۔ چٹخنی بند تھی۔ اس نے کھولی اور باہر نکلی۔ اُس وقت دونوں آدمی سیڑھیاں اتر چکے تھے۔ زاہدہ نے باہر سے دروازے کی زنجیر چڑھا دی اور اندھا دھند گلی میں دوڑ پڑی۔ سڑک پر بھی دوڑتی گئی۔ اس کا جسم غموں نے کمزور کر دیا تھا۔ یہ کوئی ویران سی سڑک تھی۔ ایک جگہ اس کی ٹانگوں نے جواب دے دیا اور وہ بیٹھ گئی۔ اس کے تعاقب میں کوئی نہیں آرہا تھا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس کیفیت میں ایک بوڑھا سا آدمی جس کے ساتھ اس کی عمر کی ایک عورت تھی، اس کے پاس رُک گیا۔ اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔

زاہدہ نے ہانپتے اور روتے ہوئے بتایا کہ اس پر کیا بیتی ہے۔

یہ بوڑھا اُسے اپنے گھر لے گیا۔

یہ کوئی غریب لوگ تھے۔ انہوں نے زاہدہ کو پناہ دی۔ بوڑھے کا ایک بیٹا جوان تھا جو کسی چھوٹے سے کارخانے میں کام کرتا تھا۔ بوڑھا زاہدہ کو ریفیوجی کیمپ میں لے جانے کو کہہ رہا تھا، لیکن زاہدہ کی ذہنی حالت ایسی ہوگئی تھی جیسے پاکستان بننے سے پہلے والی زاہدہ مرگئی ہو۔ اُسے اس حادثے نے ذہنی طور پر مفلوج کردیا کہ جس پاکستان کے لئے اس نے جان کی بازی لگائی تھی اور جس پاکستان کی خاطر اُس کا پورا کنبہ قربان ہوگیا اور بہن اغوا ہوگئی، اس پاکستان میں اس کی عصمت نیلامی پر رکھی گئی۔

مختصر یہ کہ زاہدہ اپنی اصلیت کو مار کر اسی گھر کی ہورہی۔ اس گھر میں پیار تھا، خلوص تھا۔ اس نے اس بوڑھے کے بیٹے سے شادی کرلی۔ وقت گزرنے لگا۔ بوڑھا اور بڑھیا مرگئے۔ زاہدہ کے بچے پیدا ہوئے۔ اب وہ اس احاطے میں آباد ہے مگر اپنے بچوں کو تعلیم دلانے سے معذور۔ وہ خود چند ایک بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہے۔ اس کا خاوند کارخانے میں کام کرتے کرتے بوڑھا ہوگیا ہے میاں بیوی کی آمدنی بڑھتی گئی اور اس سے دُگنے حساب سے مہنگائی بڑھتی گئی، اس لئے زاہدہ کا کنبہ اس احاطے سے آزادانہ ہوسکا۔ مجھے اُمید ہے کہ زاہدہ کے دو بیٹے اپنے خاندان کو احاطے سے نکال لیں گے۔

زاہدہ کی بیٹی کے مستقبل کو میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اس کے تمام اخراجات کی ذمہ داری میں نے سنبھال لی ہے۔

زاہدہ قانع اور مطمئن ہے۔ میں نے اُسے بعد کی ایک ملاقات میں کہا تھا کہ میں یہ داستان لکھوں گا۔ اس نے اجازت دے کر کہا —— ''یہ ضرور لکھنا کہ مجھے کسی کی ہمدردی اور مدد کی ضرورت نہیں، اور یہ بھی لکھنا کہ پاکستان کے جھنڈے میں میری بہن جیسی ہزاروں بہنوں کی عصمت کا خون شامل ہے۔ ان میں وہ بھی ہیں جن کی عصمتیں پاکستان میں آکر لُٹ گئی تھیں۔ یہ ضرور لکھنا، شاید قوم کی غیرت جاگ اُٹھے شاید کوئی محمد بن قاسم صحراؤں، چٹانوں اور دریاؤں کو چیرتا آجائے اور اس قوم کو غیرت منداور پُروقار بنادے''۔